جنت کا میوہ

احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں
کامیاب زندگی گزارنے کے رہنما اصول

ترجمہ

الاستاذ محمد رمضان

DATA ENTERED

زاویہ پبلشرز
۶۔ مرکز الاویس (بستا ہوٹل) دربار مارکیٹ۔ لاہور
فون: ۷۲۴۸۶۵۷ — موبائل: ۰۳۰۰-۹۴۶۷۰۴۷

Marfat.com

۲۹۷۶۲۲
ح ۴۴۱۵
۷۵۶۰۷

زاویہ پبلشرز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۲۰۰۳ء

بار اوّل ______ ۶۰۰

ہدیہ ______ 90 روپے

○

زیرِ اہتمام

نجابت علی تارڑ

ملنے کے پتے

- مکتبہ جمالِ کرم ۔ ۹ مرکز الاویس ۔ دربار مارکیٹ ۔ لاہور ۷۳۲۴۹۴۸ ـ ۰۴۲
- ضیاء القرآن پبلی کیشنز ۔ گنج بخش روڈ ۔ لاہور ۷۲۲۱۹۵۳ ـ ۰۴۲
- ضیاء القرآن پبلی کیشنز ۔ انفال سنٹر ۔ اردو بازار ۔ کراچی ۲۲۱۰۲۱۲ ـ ۰۲۱
- احمد بک کارپوریشن ۔ کمیٹی چوک ۔ راولپنڈی 051-۵۵۵۸۳۲۰
- مکتبہ المجاہد ۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ ۔ بھیرہ شریف ۰۴۵۲۱-۹۱۰۷۶۳
- مکتبہ مرتضویہ ۔ بیربل شریف ضلع سرگودھا ۰۴۵۱-۷۹۹۵۹۲-Ex۲۲۸

فہرست

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ نمبر
1	دیباچہ	7
2	اخلاق	11
3	اسلام اور اخلاق حسنہ	13
4	اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز	33
5	اسلام کا فلسفہ اخلاق	42
6	اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ	107
7	تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب	165
8	اخلاقی تعلیمات کی قسمیں	179
9	حقوق و فرائض	180
10	والدین کا حق	188
11	اولاد کا حق	201
12	حقوق زوجین	218
13	اہل قرابت کے حقوق	239

Marfat.com

14	ہمسایہ کے حقوق	245
15	یتیموں کے حقوق	253
16	بیوہ کے ساتھ حسن سلوک	262
17	حاجت مندوں کے حقوق	267
18	بیمار کے حقوق	272
19	غلاموں کے حقوق	277
20	مہمان کے حقوق	281
21	انسانی برادری کا حق	286
22	مسلمانوں کے باہمی حقوق	292
23	جانوروں کے حقوق	305
24	فضائل اخلاق	313
25	صدق	322
26	سخاوت	339
27	عفت وپاکبازی	360
28	دیانتداری اور امانت	380
29	شرم وحیا	389

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
رَسُوْلِہٖ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اُولِی الْعَزْمِ وَالْھِمَّۃِ

دیباچہ

اے تو. بہ ہمہ صفت سزاوار — نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ زگنج خانۂ راز — بر آدمیاں درِ سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد — حکمت ز تو یافت آدمی زاد

در قربتِ حضرتِ مقدس — پیغمبرِ پاک رہبرِ بس
گنجینۂ کیمیائے عالم — پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسرِ پادشاہی — توقیعِ سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے۔ یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت

Marfat.com

ے جتنی اہمیت ہے عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لئے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ اسمائے حُسنیٰ کا پرتو ہیں، بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق خالق تعالیٰ کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے۔ بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدا تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں۔ جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر خدا کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں حالانکہ حقیقی صفت علم خدا میں ہے بندہ میں نہیں لیکن چونکہ خدا تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے اس لئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں[1] ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کی دوسری صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے۔ اسی لئے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک، اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے۔ اور بس:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ○ (الشوریٰ : ۱)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں

---

[1] تفصیل کے لئے: دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص۵۳ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور

Marfat.com

جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لئے بالکل مناسب تھی یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لئے تکمیل فرمادی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آگئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے۔ ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک نقشہ مرتب کیا جائے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کرلیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو و خطا انسان کی فطرت ہے پھر کیونکر دعوی کروں کہ اس سے میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزاء پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں رحمہ اللہ تعالیٰ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینہ محمدیؐ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اخلاق

عقائداور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے۔ اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ اُس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز اور رشتہ دار، دوست و احباب سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اُس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے متعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے۔ اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں آپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے

Marfat.com

راستہ سے بہکنے نہ دے۔ دُنیا کے سارے مذہبوں نے کم و بیش اسی کی کوشش کی ہے اور دُنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے اُس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

Marfat.com

اِسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے سارے مذہبوں کی بُنیاد اخلاق ہی پر ہے چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے۔ خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دُوسرے ابواب کی طرح اِس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ خود آپؐ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ — میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

(موطا مالک، حسن اخلاق)

یہ امام مالکؒ کی مؤطا کی روایت ہے۔ مسند احمد، بیہقی اور ابنِ سعدؒ وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں آپؐ نے فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ — میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا۔ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبرؐ کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق

لہ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲۔ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ۔

Marfat.com

کے لئے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس آکر آپؐ کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے:

رأيته يأمر بمكارم الاخلاق۔ میں نے اس کو دیکھا کر وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

(حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں):

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا..... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔"

اسی طرح قیصرِ روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ "وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔"

قرآن مجید نے جا بجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہا ہے:

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعۃ: ۲) یہ پیغمبر ان پڑھ جاہلوں کو پاک صاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

۱؎: صحیح مسلم مناقب ابی ذرؓ ـ جلد ۲ صفحہ ۲۲۹ مصر ۲؎ ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد، ج ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت۔ ۳؎ صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد۔

Marfat.com

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں۔ ایک پاک و صاف کرنا جس کو قرآنِ پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

ا۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا۔ نکھارنا۔ میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جِلا پیدا کر دی جائے۔ سورۂ شمس میں ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

(الشمس: ۷۔۱۰)

قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی۔ بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱۴۔۱۵)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک و صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝

(عبس: ۱۔۴)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا۔ اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا۔ یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔

ان آیتوں سے اندازہ ہو گا کہ قرآن پاک میں اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام

Marfat.com

کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جِلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور اُن کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔ چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دُشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔ حکمت: اس کے بعد دُوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اُس علم وعرفان کے معنی میں ہے جو نُورِ الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسُول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم وعرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔ قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل: ۳۹)

یہ حکمت کی اُن باتوں میں سے ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورۂ لقمان میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (لقمٰن: ۱۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر۔

Marfat.com

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ، اور بُری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔ ان آیتوں سے معلوم ہُوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امورِ خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلّم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں "حکمت" کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے، کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحی محمدیؐ کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں۔ خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا	اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ
وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ	کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (الحج : ۷۷)	تاکہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کی رُوح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہیں۔ ایک عبادت اور دوسرا اخلاق۔ ایک خالق کا حق، دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے۔ مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی

Marfat.com

کوتاہی اور تقصیر کی معافی خُدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہُوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الرّاحمین کی بے نیاز ذات سے ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اُس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دُنیا میں وُہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ "قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خُدا نہ کرے گا، دُوسری وُہ جس میں سے خُدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے جیسے اُس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا لیکن وُہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وُہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔"[2] اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامۃ، صفحہ ۹۶۷۔ [2] مسند احمد و حاکم من عائشۃؓ، ثبت یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو بدائع الصنائع کتاب الحج و کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں سے باز رکھتی ہے۔ روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سراپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہرِ معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں۔ وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔ قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں حضراتِ صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کتنے نمازی ہیں جنہوں نے گو شراب نہیں پی مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے

Marfat.com

کردہ کیا کہ رہے ہیں سا آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ پھر فرمایا کہ "نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے" اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ!" جس نے یہ بات نہیں پیدا کی اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا۔ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے۔"[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لئے فرض کی گئی اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ خدا کی یاد کی جائے تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یاد الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے! حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔[2]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں۔"

اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپؐ نے فرمائے۔ ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کرنا چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"[3] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

---

[1] احیاء العلوم جلد اول باب فضیلۃ الخشوع [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵۔ [3] صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ کتاب الصوم۔

Marfat.com

اخلاقِ حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصل ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝

(المؤمنون: ۱-۵ و ۸-۹)

بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے تقویٰ ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

Marfat.com

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ
السَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ
فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ
الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ۭ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

(البقرۃ : ۱۷۷)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود یا خدا کی محبت کے سبب سے اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو، اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں یہی وہ ہیں جو راستباز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راست بازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور خدا کا نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی بات خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں۔

چنانچہ سورہ فرقان میں ارشاد ہوا:

45407

Marfat.com

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى
الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِيْنَ
يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا
كَانَ غَرَامًا ○ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا
وَّمُقَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا
لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ
ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ
لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ
اَثَامًا ○

....

....

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا
مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ
اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا

اور رحم والے خدا کے بندے وُہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ اُن سے بات کریں تو وُہ سلام کہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے۔ اور جہنم بُرا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وُہ سیدھے گذریں اور خدا کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا ناحق خون نہیں کرتے جس کو خُدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔

اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغویات پر گذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں

Marfat.com

عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیویاں بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

(الفرقان: ۶۳-۶۸-۷۲-۷۴)

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگذر میانہ روی اور قتل و خونریزی، بدکاری نہ کرنا اور مکر و زُور میں شریک نہ ہونا خیر اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔ اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے

عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ
عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ
يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَمَنْ
صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ
الْاُمُوْرِ ○

(الشوریٰ: ۳۶-۴۳)

تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے
تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے وہ
ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور
اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو
اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو
اُن پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے
ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں
ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔
اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی)
ظالم کو معاف کر دے اور سہہ لے تو یہ
ہمت کے کام ہیں۔

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ
اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

جنت ان پرہیزگاروں کے لئے تیار
کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں
حالتوں میں خُدا کی راہ میں کچھ خرچ
کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور
لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا اچھے
کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ
بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ

یہ وہ ہیں جن کو دُہرا ثواب ملے گا اس
لئے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بُرائی کو

Marfat.com

السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ○ (القصص: ۵۴-۵۵)

بھلائی سے دُور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے۔ تم سلامت رہو ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ (الدّھر: ۸)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے۔ ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے۔

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت و اصرف عنی سیئاتھا لا یصرف عنی سیئاتھا الا انت۔

اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو

Marfat.com

نہیں پھیر سکتا لیکن تو۔ (مسلم: باب الدعاء فی الصلوٰۃ)

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرمایا:

أکمل المؤمنین ایماناً احسنہم خلقاً۔ مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے۔ارشاد ہوا:

انّ الرّجل لیدرکُ عن خلقہ درجۃ قائم اللّیل وصائم النّھار۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہی درجہ حسنِ خُلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے حُسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے فرمایا:

خیارکم احسنکم اخلاقاً۔ (بخاری: کتاب الادب)
تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ما من شیٔ یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فانّ صاحب حسن الخلق لیبلغ بہ درجۃ صاحب الصوم والصلوٰۃ۔
(قیامت کی) ترازو میں حُسنِ خُلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حُسنِ اخلاق والا اپنے حُسنِ خُلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے۔ لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ "حُسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں"۔ اس حدیثِ نبویؐ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حُسنِ اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

خیر ما اعطی الناس خلق حسن۔
لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حنبل، طبرانی اور ابنِ شیبہ میں ہے۔ اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احب عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً۔ (طبرانی)
اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خُلق خُدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسولؐ کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ فرمایا:

ان احبکم الیّ واقربکم منّی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الیّ و ابعدکم منّی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقاً[1]

تم میں میرا سب سے پیارا اور قیامت کے دن نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں۔ ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں۔ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی"۔ اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی"۔ ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے۔ فرمایا[2] "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ۔ اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا نیکی بتا اور برائی سے روک۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک"۔ غور کیجئے کہ یہ حدیث

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اوّل سے ماخوذ ہیں۔ [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یؤذی جارہ۔

Marfat.com

اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے[1]۔

ایمان کے اوصاف و لوازم ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں جتنا ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی و کمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغِ زیرِ دامن ہے جسکی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اسکی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا:

۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو تاکہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا جس کو خدا اور اس کا رسولؐ سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جزو ہیں۔ مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

---

[1] مشکل الآثار امام طحاوی جلد نمبر ۲ صفحہ ۱ حیدرآباد دکن۔

Marfat.com

۷۔ مسلمان وُہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وُہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں۔

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا اسلام سب سے بہتر ہے"؟ فرمایا "(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا" (سلام کرنا)۔

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ "اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے"؟ فرمایا "اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا"۔ پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا "صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا" (سماحت)۔

۱۰۔ مومن وُہ ہے جو دوسروں سے الُفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے۔ جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا۔ جو کسی مُسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳۔ مومن وُہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ مہاجر وُہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصے سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴۔ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵۔ بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہیں۔ بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

ے یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے۔ کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں، مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

Marfat.com

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاقِ حسنہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہیں لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔ ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا۔ نیز بعض ایسی پرجلال صفتیں بھی ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ اُن کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل[1] ہے۔ اخلاق کی اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[1] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اوّل صفحات ۳۸۴ — ۴۰۵۔

Marfat.com

اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہہ کیا اور آدابِ اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کیے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے۔ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درس گاہِ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی۔ دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور معلمینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ حکم خداوندی کو قرار دیا۔ اس حکم و فرمانِ الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام

Marfat.com

و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے۔ دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غائت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے۔ اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ دری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیا اور حکماء میں جو اصلی فرق و امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، اُن کے مقدس کارنامے اور اُن کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سُراغ لگایا ہے عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا وہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے دل اور ہاتھ نہیں اس لئے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہوجاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔ جو اُن کی تعلیم ہے وہی اُن کا عمل ہے۔ جو ان

پر ہے وہی دل میں ہے اس لئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہمنشینوں کو عطر بنا دیتا ہے یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے۔ سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر کوئی شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کرہ پر انسان کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں۔ ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں۔ الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے:

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

(۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کار آمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبرِ اسلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامع کمالات نہیں۔ دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیٔ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے

Marfat.com

اس طرح بے نقاب ہو کر گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے تم تورات کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں اُن غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو تورات کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ اُن کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت موسے علیہا السلام تک تورات کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ۔ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پُوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہو گا کہ اس کے لیے دُنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے صرف اسلام ہی کے ایک معلّم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دُنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ "یہاں (سیرتِ محمدی میں) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں[1] ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو جو حجرہ میں کہوں سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب[2]۔

قول کے ساتھ عمل اب دوسری حیثیت سے غور کیجیے۔ ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی اخلا

---

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ص ۱۰، [2] خطبہ حجۃ الوداع۔

احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پُر تاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی معصومانہ باتیں، سچائی و راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے کہا کہ سب کچھ تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں نہ لٹا دو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے۔" کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔" کیا اُس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنوں کو بھی پیار کرو۔" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر۔" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہ تھیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ انجیل نے اُن کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے کہ اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا۔ اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ [2]

(کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

---

[1] انجیل [2] البقرۃ: ۴۴۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ٥ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ٥[1]

(تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔)

ایک شخص نے اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا كَانَ خُلُقُه الْقُرْآن[2] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا۔ خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا۔ اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا۔ کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا۔ اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ جنہوں نے آپ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں مسلح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کی صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیٔ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اُس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا۔ فرمایا:

---

[1] الصف: ۲-۳۔ [2] ابو داؤد باب صلوٰۃ اللیل۔

Marfat.com

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (یونس: ۱۶)
(اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا گیا:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ○ (ن: ۴)
(اے محمد ﷺ!) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو۔ اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے؟ کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے؟ یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعة: ۲)
وہ اُن کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک

Marfat.com

کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

اخلاقی تعلیم کا تنوع اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے دوسرے معلمین کی درس گاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہِ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے۔ خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپؐ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپؐ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپؐ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مدینۃ النبیؐ کی اس درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجور کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجدِ نبوی تھا۔ اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں۔ کہیں ابوبکر و عمر و عثمان و علی جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں کہیں علقمہ و زبیر و معاذ و سعد بن معاذ و سعد بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں کہیں خالد، ابو عبیدہ

سعد بن ابی وقاص اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے سپہ سالار ہیں کہیں وہ ہیں جو بعد میں صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ و سلمانؓ و ابو درداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے۔ مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔ سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔[1]

---

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں
میں الجھنا ہوگا۔ اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس
کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے۔ مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب و علل کی
تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی
اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیرِ سایہ پرانے نظریوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور
غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے۔ ہر سوال
کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان
میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور
پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا
گیا ہے۔ موجودہ اصطلاح میں پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "انا دیہ" کہہ لیجئے یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے
یوں کہیے کہ پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے اور دوسرا "عقل" پر۔ پھر اس منشائے اختلاف
کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا
منبع نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

Marfat.com

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں۔ علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے۔ جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لاسکے انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا۔ پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر۔ جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا انہوں نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا جو اخلاق کے امہاتِ مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو۔ لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کردے۔ فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریئے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات ضمیر،

فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں۔ اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہو سکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے۔ ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے۔ ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو۔ اسی لئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے عمومی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر کل آب و ہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں۔ اب یہ کاوش کہ جس طرح

مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسّے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسّہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور بُرائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعے سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوب صورتی اور بدصورتی کا یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو ہر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدی نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہیں تفصیل اور کہیں اجمالی اشارات کئے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ اُن کے عمل میں ہے اس لئے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے اسی بنا پر اس نے اِن اصولوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اُن کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں۔ وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں انہی احکامِ الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسّہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے ہونا چاہیے۔ ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہو گی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ ہم کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیئے، اس کا وجدان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسان کی کثیر جماعت

Marfat.com

کا فائدہ بھی سمجھے۔ الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسا
ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا۔ اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ
بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس
اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال میں نقص پیدا
کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک
نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک ا
کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل
نقص ہے۔ اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض
وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ
رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لئے ا
کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہ
ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی۔ مذہبی کاموں
کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل
ہے اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے۔ ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت
چُن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطرداری کی تہ میں ذاتی نفع یا ریاکاری یا نمائش یا خوشا
کہنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت
جاتی ہے لیکن ہم اگر کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اس کی وقعت
اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات

Marfat.com

روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت | اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور بُرے کام کی بُنیاد قرار دیا ہے۔ بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائیں گے۔ اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اسے کچھ اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو مگر اس بلانے والے کی نیت کی بُرائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا تو وہ بُلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بُری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے میری جیب میں روپوں کا ایک بٹوا تھا اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی بُرائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے بُرائی کر چکا لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی بُرائی سے پاک ہے۔ راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بُری نیت

سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بیگناہی بالکل ظاہر ہے۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا۔

سورہ آل عمران میں ہے :

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط (آل عمران: ۱۴۵)

اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ فرمایا :

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط (البقرۃ: ۲۶۴)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں :

Marfat.com

اِنّما الاعمال بالنّیات۔	انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

ولکل امرئٍ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ فھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہٖ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الیٰ ما ھاجر الیہ۔	ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لئے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حُسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حُسنِ خُلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کے مدُود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

جدید فلسفۂ اخلاق کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جان، ایس میکنزی اپنی تصنیف "مینول آف ایتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

"جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے۔ اس کا کام

---

[1] صحیح بخاری جلد اول، باب ما جاء ان الاعمال بالنیۃ۔ [2] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

Marfat.com

تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے۔ جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں اُن کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں.....

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے۔

"اسی لئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ "بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے۔"[1]

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں۔ دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔ پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادے سے وجود قطعی محال ہے۔ اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا ہر نیک کام کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ ۙ

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا

---

[1] علم اخلاق، کتاب اول، باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبد الباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۲۱ھ

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ: ۲۶۴)

ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔا (النور: ۳۹)

اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہیں پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور: ۴۰)

یا (خدا اور قیامت کے نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے

Marfat.com

باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہے۔

غرض وغایت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض وغایت اسکی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض وغایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوسکے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضیں اور غایتیں ہوسکتی ہیں۔ ہم راہ میں ایک بڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اور اس کو اس کے گھر تک بآرام پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہوکر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا۔ یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے۔ یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے۔ یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے۔ بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے وہ اپنی اس خوشی کے لئے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہوکر یہ کام کرتے ہیں۔ غرض ایک ہی قسم کے کام کی یہ تمام مختلف اغراض مختلف

اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے۔ کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔ اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بلند ہے پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے۔ مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں، لیکن اُس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے۔ اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدیؐ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے۔ غریب و لاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ

Marfat.com

طاری ہوتا ہے۔ قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطری
ہر انسان کے ضمیر میں ہے۔ ہر اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ
تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے لیکن بُری صحبت، بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ
اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل
میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے
شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو
جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب و
بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی
اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی
کہ اللہ تعالےٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ ا
کے نتائج ہیں قرآن کہتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ (الشمس: ۸)
ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے
وحیِ محمدی کی اصطلاح میں اُس کا نام نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ
ہمارے دل کے اندر ہے۔ سورۂ قیامت میں ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ (القیامہ ۲)
اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ۝

بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگرچہ وُہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔ (القیامہ: ۱۴-۱۵)

نواس بن سمعان انصاریؓ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں۔ آخر ایک دِن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا۔ فرمایا "نیکی حُسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وُہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں"۔ اسی طرح وابصہ بن معبدؓ نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے۔ چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا "وابصہ قریب آجاؤ"۔ جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہ میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے"۔ عرض کی "حضورہی ارشاد فرمائیں"۔ فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو"۔ عرض کی "سچ ہے یا رسُول اللہ"۔ فرمایا:

یا وابصۃ استفت قلبک واستفت نفسک البرّ ما اطمأنّت الیہ القلب واطمأنّت الیہ النّفس والاثم ما حاک فی القلب و تردّد فی النفس و ان افتاک

اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے

النَّاسُ۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں

یہی وہ حاسۂ اخلاق ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگرچہ ہوش میں آکر جب وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان ونادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے۔ لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

ان العبد اذا اخطأ خطیئة	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے
نکتت فی قلبه نکتةٌ سوداء	دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا
فاذا ھو نزع واستغفر و	ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ
تاب صقل قلبه وان عاد	کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور
زید فیھا حتّٰی یعلو قلبه۔[1]	توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے
	اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ
	داغ بڑھایا جاتا ہے، یہانتک کہ
	وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۲ ص ۲۹۸، مصر۔ [2] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

Marfat.com

كَلَّا بَلْ سَكَنْتَرَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (التطفیف: ۱۴)

کبھی نہیں بلکہ اُن کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں۔ راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر اُدھر مڑو نہیں۔ جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان داہیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کی ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کی حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے

ھو واعظ اللّٰہ فی قلب کل مؤمنٍ[1]

وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کبھی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتے اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتے ہیں، گو تمام تر صحیح نہیں ہے تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد وبیہقی فی شعب الایمان و رزین و ترمذی مختصراً۔

Marfat.com

کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور بُرائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ اُن کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیئے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں۔ ایک غریب لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں۔ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ ہے خدا اور اس کی رضامندی کا حصول

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض و غایت نہیں بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں۔ اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا
وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ	اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ	کے دکھایا۔ اور کفر اور گناہ اور نافرمانی
اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝	سے گھن لگادی۔ یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

(الحجرات: ۷)

اسی آیتِ پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح

اذا سرّتك حسنتك وساءتك	جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور

Marfat.com

سیئتك فانت مؤمن[۱] — تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔

من سرّته حسنته وساءته سیئته فهو مؤمن[۲] — جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنائے وہ مومن ہے۔

من عمل سیئة فکرهها حین یعمل وعمل حسنة فسرّ فهو مؤمن[۳] — جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ قۂ لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجایش باقی رکھی ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ رسے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار ی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے۔ ایک سچے مسلمان کو صرف اسی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے یں آکر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حکمائے اخلاق یہ

مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۴ رآباد و منتخب شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر و ابن حبان و ابوداؤد عن عمر بن الخطاب۔ ۲ طبرانی فی الکبیر ابی موسیٰ کنز العمال جلد اول صفحہ ۷، ۳۔ ۳ مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۳ حیدر آباد۔

Marfat.com

ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے اور معلم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہیے۔ انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن عمل ہے۔ پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ○ (البقرة: ۲۰۷)	بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں۔ اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرة: ۲۶۵)	اور اُن کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ (البقرة: ۲۷۲)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء: ۱۱۴)	اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ	اور جنہوں نے خدا کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو اُن کو دیا ہے اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقے سے

Marfat.com

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ○ (الرعد : ۲۲)	خرچ کیا اور بُرائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے ؛

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ○ (الليل : ۱۸-۲۰)	جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے۔ کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے۔ ایک صحابی پوچھتے ہیں "یا رسول اللہ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لیے کہ اُس کو شہرت حاصل ہو تو ان میں سے راہِ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے"۔ فرمایا "اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو"[۱]
ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے۔ اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اُس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔ پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے"[۲]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۹۴ [۲] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ۔

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روتے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ گھٹنے ٹیکے ہوگی اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا "کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اُتارا تھا تو تو نے اس پر کیا عمل کیا؟" وہ عرض کرے گا "بارِ الٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا" خدا فرمائے گا "تو جھوٹا ہے۔" فرشتے بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے۔" پھر خدا فرمائے گا "تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے۔ تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا" (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا)۔ پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا "کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟" عرض کرے گا "کیوں نہیں اے میرے ربّ!" خدا دریافت کرے گا "تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟" جو دے گا "میں اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا۔" ارشاد ہوگا "تو جھوٹا ہے" فر بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے۔" پھر خدا فرمائے گا "تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو سخی ہے تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا" (تو اپنا بدلہ پا چکا)۔ اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا "تو کس بات کے لیے مارا گیا؟" کہے گا "خدایا! نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا۔" خدا فرمائے گا "تو جھوٹا ہے۔" فرشتے بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے۔" خدا کہے گا "تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا۔" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جو سب

بلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ؔ

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے پھر بولے "خدا اور اس کا رسولؐ سچا ہے" اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (ھود: ۱۵-۱۶)

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے بے کم و کاست۔ ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر دوزخ۔ اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے۔ بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے:

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ (البقرۃ: ۲۷۲)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد: ۲۲)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔

ؔ جامع ترمذی ابواب الزہد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ۔

Marfat.com

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ إِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى ۝ (الیل: ۱۹-۲۰)

اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الروم: ۳۸)

تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ نفسِ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے۔ توراۃ اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھتی ہے جس میں کسی اصول اور غرض وغایت علت ومصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی۔ انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاق کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے۔ ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے ہے۔ عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر اس کے باپ اور ماں حضرت آدمؑ اور حواؑ گناہ گار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت منتقل ہوتا چلا آیا ہے جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلط

Marfat.com

ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں
تا۔ اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گنہگار مرا اور آسمانی بادشاہی کی
رود میں وہ داخل نہ ہو گا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا کیوں کہ مسیح کے نام سے اس نے
جات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے
طْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر
لَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل
ر چکا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس
انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے
لہٰ تعالےٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حرف لکھے ہیں وُہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اُن
و ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین: ۴)
ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی ساخت پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ (الانفطار: ۷-۸)
جس خدا نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا۔ پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے۔ اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے
مقررہ دن کا بیان ہے اس کے بعد یہ آیت ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا

ہے۔ اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں، یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخشا۔ نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قوی کا اعتدال داخل ہے۔ دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱-۳)

اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا۔ اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔

راہ دیکھنا یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح دوسرے بیسیوں قوی اس نے ودیعت رکھے ہیں۔ سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر: ۲-۳)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا۔ ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار (نیکوکار) ہوتا ہے، یا ناشکر (بدکردار)۔

غرض اُس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی۔ اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا بُرا ہو جانا خود اس کا کام ہے۔ سورۂ شمس

Marfat.com

اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

(الشمس، ۷-۱۰)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی۔ پھر ہم نے اس کو الہام کر دی (یا سوجھا دی) اس کی نیکی اور بدی۔ تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا۔ اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا)۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیاں کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے۔ اسی لیے یہ کہا گیا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(الروم، ۳۰)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دین فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و

سالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت او
صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت
بیان کیا ہے۔ انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی اروا
دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انہوں نے اپنی زبان حا
یا قال سے بالاتفاق جواب دیا بَلٰى "ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے"۔ یہی ازلی اور فط
اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ "دیکھو شیط
نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ"۔

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت میں معصوم اور بے داغ
پیدا ہوتا ہے۔ وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر
نہیں لاتا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى — اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اُٹھاتا۔

(الفاطر:۱۸)

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ — ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

(الطور:۲۱)

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا لا یجنی جانٍ علی ولدہٖ ولا مولودٌ علی والدہٖ۔[۲] — ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

---

[۱] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الایمان۔ [۲] سنن ابن ماجہ کتاب الحج، باب الخطبہ یوم النحر۔

اسی طرح اُن مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے۔ اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہوتا ہے۔

اب غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گناہگار اور جہنم کا ایندھن ہے۔ آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے۔ فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے"[1]

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "جس مسلمان کے بچے بچپن میں مر گئے وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شیرخوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا "یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا"[3] اس سے زیادہ یہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق، ترمذی فی من لایجب علیہ الحد۔

[2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد۔

[3] ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

Marfat.com

کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے فرمایا
"خدا کو علم ہے، کہ یہ کیا ہوتے۔"[1] لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی۔ ایک دفعہ
رویا میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں
کا ہجوم تھا۔ فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دینِ فطرت پر مر گئے۔ صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہ
مشرکوں کے بچے"؟ فرمایا "اور مشرکوں کے بچے بھی۔"[2] ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ
کمسنی میں مرجانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا
کا کام ہے اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپؐ نے مناسب نہیں سمجھا۔
ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی "یا رسولؐ اللہ! اس کو مبارک ہو۔ یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا
تھی۔ نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔" فرمایا "اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ
پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ۔"[3] ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے
والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے دوسری طرف اسلام ہے جو اُن کے لیے جنت کا دروازہ
کھولتا ہے اور اُن کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے "خداوندا! اس کو میرے
لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔" احادیث
میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہوجانے کا ذکر
آتا ہے، اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہوجاتا ہے
کہ گویا اُس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے۔"[4]

---

[1] صحیح مسلم کتاب القدر [2] صحیح بخاری کتاب التعبیر، باب التعبیر الرویا بعد صلوٰۃ الصبح [3] یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں نیز امام نووی کی
شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد" جلد ۲ صفحہ ۳۲۲ و ۳۲۷ نولکشور [4] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا۔ وصحیح بخاری
و ترمذی کتاب الحج۔

Marfat.com

خوف و رجا اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے۔ یونان کے فلسفیوں
ں دو گروہ گزرے ہیں۔ ایک کو رونے والے فلسفی دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں۔
لا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نا اُمیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اس کو دنیا تمام تر تاریک
ر خار زار نظر آتی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق
ے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی
ورت بنا لو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے۔ دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل
ے غم کی فکر نہ کرو۔ اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں۔ پہلے نظریہ پر اگر یقین
ر تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے
ا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے وہ بادۂ غفلت میں مست و
سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں
کے بیچ سے نکلی ہے۔ وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت
یں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ
اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے۔ اُس کی شریعت میں خدا سے ناامیدی
اور کفر ایک ہے۔ وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا اُمید بنا کر بے سہارا
نہیں ہونے دیتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَانِطِينَ ۝ (الحجر: ۵۵) (ابراہیم) ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی۔

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ اور اللہ کے فیض سے نا اُمید مت ہو۔

Marfat.com

لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ ○ (یوسف: ۸۷)

اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔

اس اُمت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ (الزمر: ۵۳)

اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت سے ناامید مت بنو۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر اُمید رہنے کی تاکید کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں اپنے بندے کے گمان کے پاس رہتا ہوں[1]" یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لیے ہو جاتا ہوں۔ اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیتِ کریمہ ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَیَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (الزمر: ۹)

بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا اُمیدوار ہے۔

یعنی اُس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں۔ گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں دیتا اور یہ اُمید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی اسی لیے ایک مسلمان کا دِ

[1] جامع ترمذی، کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

Marfat.com

یشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے۔اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہل
یمان سے کہتا ہے :

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۚ اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو
(النساء: ۱۰۴) کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں
پیدا ہوتا ہے۔کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اُس کو نہیں
پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے۔وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں
ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے۔لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں
بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا ام بہر حال
اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا۔اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو
خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا۔ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو ہر
نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور اُن کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ
کام کرنا سکھا دیا ہے۔اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور نا اُمیدی
کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے۔ ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے
کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں۔یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں
ذرا ذرا سی نا اُمیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے۔جس وقت یہ سطریں لکھ
لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک
مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں
بھی نا اُمیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اُس کی آس نہیں ٹوٹتی۔امید

Marfat.com

ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند، دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پر اُمید رہتا ہے۔ مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے نا اُمیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ — میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

(آل عمران: ۱۹۵)

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے جو رہبانیت اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز و قریب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطعِ تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدتمند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد

Marfat.com

ر جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیرِ پردہ رکھ کر جھوٹا دس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے بھوٹے عذر کی بنا پر کبھی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست احباب اور قوم و ملت کے فرائض و حقوق بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں۔ اسی لیے سلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجرّدانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں ں ہے۔ نبوّت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے۔ یہی طرزِ عمل لفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ کا تھا اور پورا قرآنِ پاک اسی انسانی جدوجہد ور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ تجرّد، علیحدگی، خلوت نشینی ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں اُن سے ہٹ کر نہیں۔ وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں،

Marfat.com

حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں۔ اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عمل یہ مستحسن طریقہ نہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: ۶)

تم اپنے کو اور اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اس سے اُس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان[1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیے وحیِ محمدیؐ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کیا اور کہا:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً (الانفال: ۲۵)

اور اس فساد سے بچو جو چُن کر صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپیٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأة راعیة فی بیت زوجہا۔ ص ۷۸۳۔

Marfat.com

دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت سی تکلیفیں ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے اسی لیے جو شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم[5]	وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے جب جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں۔ فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[5] شعب الایمان بیہقی و جامع ترمذی، کتاب الزہد صفحہ ۴۱۲۔

Marfat.com

نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی
آپؐ نے فرمایا کہ" بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر
سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ
سے کمزور ایمان ہے[1]۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر
سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جو
کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی ا
فرض کا شرعی نام" امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری با
روکنا) ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

(تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی۔ اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔)

يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: ۷۱)

(وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔)

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

Marfat.com

الْمُنْكَرِ (لقمان:۱۷) سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد: ۱۷) اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر:۳) اور وہ آپس میں سچائی اور ثبات قدم کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟"[1] عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی۔" قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے

---

[1] سفر تکوین۔ ۴:۹۔

کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اُس کو سمجھاتا تھا تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ جن کو اللہ تعالےٰ اُن کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے۔ لیکن اُن پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا۔ پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت اور تیسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے۔ سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے۔ آخر میں ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ
قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ
عَذَابًا شَدِيْدًا ۗ قَالُوْا مَعْذِرَةً
اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا
نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ

اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے

Marfat.com

يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

(الاعراف: ۱۶۴-۱۶۵)

آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے اُن کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گنہگاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا۔ البتہ بھائی کا فرض اُس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اُس کا کیا بلکہ خود رسُول کا بھی یہ فرض نہیں فرمایا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ

رسُول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔

(المائدۃ: ۹۹/ النور: ۵۴)

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

(المائدۃ: ۱۰۵)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیتِ پاک کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت
کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ
ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ
کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔" ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے
معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی دریافت
کیے تو فرمایا کہ "نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو۔ لیکن جب
کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح
دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اُس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی
خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے۔"[1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں"
منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں لے
گی ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم و آداب اور اٹیکیٹس اسی اصول پر قائم
دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی کی باتیں معلوم ہوتی
ہیں جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے۔ مگر ذرا گہری نظر سے دیکھیے
تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک
سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری
سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان بُرائیوں کی
بُرائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر (المائدہ) میں ہیں، صفحہ ۴۹۸، ۴۹۹۔

آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رُکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی۔" اس کے بعد آپؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا" نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو، اور اس کو حق پر نہ جھکا دو"[1]۔

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم!

اس کی چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل وعامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرة، ۴۴)	کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	تو اپنے رب کے راستہ کی طرف

---

[1] جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

Marfat.com

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل: ۱۲۵) دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السّلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴) تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے

قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ○ (النساء: ۶۳) کہہ ان کے دل تک پہنچ جانیوالی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی، جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے۔ یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

Marfat.com

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی
ص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں
پ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے جماعت
اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی
ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم
یا کا جوہر ابھی موجود ہے جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ لیکن
لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اُس کے
ا کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو
انعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما
ا ہے کہ انما الاذن لاجل الروية۔ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے
وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس
پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم
تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر
ں کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ چنانچہ وحی محمدی نے اسی لیے تجسس اور غیبت
ن دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو کہ بے شک بعض گمان گناہ ہیں اور نہ کسی کا اندر

بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ○

کا بھید ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے۔ اللہ سے ڈرو بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات: ۱۲)

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ بھی جب کو تم اس کی غیر حاضری برا کہہ رہے ہو اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی۔ اس کی کراہ کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے و شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایان نہیں اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے ر گے تو ان کو برباد کر دو گے"[1]

غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف پنہاں ہیں۔

توسّط اور اعتدال | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب، باب النہی عن التجسس۔

Marfat.com

نصرانیت کا دور گذر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو۔ اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[1]۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے۔ اُن کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[2]۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لیے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

"تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت[3]۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بُرائی کا بُرائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دیدو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو۔ جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔"

---

[1] یہود کی سنگدلی کے سبب سے۔ [2] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لیے۔ [3] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ (متی باب ۵)

حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا وہ حضرت موسٰی علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان مُبارک سے سُن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا۔ لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ — بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے۔ (النحل:-۹۰)

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعتِ موسوی و عیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل اور احسان

"عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے۔ "عدل" کے معنی "برابر" ہیں۔ جو شخص کسی کے ساتھ بُرائی کرے اُس کے ساتھ اتنی ہی بُرائی کی جائے، یہ عدل ہے اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ احسان ہے۔ اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں۔ اس نے قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے۔ اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے قانون کو

Marfat.com

سے مٹانا، جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ کبھی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے۔ اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا استحقاق نہیں ہے کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعتِ محمدی میں پوری طرح برتی گئی ہے کیوں کہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک نرم مزاج صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے۔ بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوتے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور "برائی برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے۔ جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو۔ عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

Marfat.com

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے۔ اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اس لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کو جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول شریعتِ محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا۔ بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسروں تک پہنچتا ہے

Marfat.com

ے تحت میں رکھا مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے
ا مقرر کی ہے جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی
یلِ نفس کے متعلق تھیں ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں
ی امداد وغیرہ۔ اس طرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم
ر صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن
ں سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ بُرائی کے
لے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانونِ انتظام
ل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے
سل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو و نما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف
، بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی
ل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور
یسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس
ر ہے۔

عفو اور انتقام

موسوی، عیسوی اور محمدیؐ اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک
ق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیشِ نظر
ر کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں لیکن اگر وہ قانون
ی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو اُن کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو

چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اُس کا حکم ہے :

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا،..... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت" (احبار ۲۴ - ۱۷ خروج ۲۱ - ۱۲ گنتی ۳۵ - ۳۱ استثنا ۱۹ - ۱۱ - ۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے :

"تم سن چکے کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔" (متی ۵ - ۳۸)۔

لیکن اس سراپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا ؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ قانون ہے اور احسان اخلاق ہے اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول ا علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى (البقرۃ : ۱۷۸)	اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا۔ آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا۔ اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(البقرۃ ۱۷۸)

تو اگر اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجیے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی
نی کے باوجود اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا
ئی کہہ کر بتایا گیا۔ ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خونبہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے
ں عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول
رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خونبہا لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا۔
یوکر اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے
ے جا کرتا ہے:

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ . . . اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں

Marfat.com

بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۝

(المائدة: ۴۵-۴۶)

یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ۔ تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے۔ مالی مع
کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ

(البقرة: ۲۷۹)

اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہار
وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا

Marfat.com

یہ تو قانون تھا۔ اب اخلاق دیکھئے:

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (البقرۃ: ۲۸۰)

اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کو اُس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشایش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے۔ فرمایا:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ (النحل: ۱۲۶)

اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہو اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ۝ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ (الشوریٰ: ۳۹-۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔ تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت یں لیکن اگر کوئی اُن پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ قانون یہی ہے کہ بُرائی کا بدلہ اتنی ہی بُرائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے۔ لیکن اگر کوئی

Marfat.com

مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کو
اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا۔ اور بلاغت یہ
اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا
اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن
رہ سکتا ہے۔ اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ ا
عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہی ایک
مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام
کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے جس کی نظر انسانی ہستی کے
نظام پر ہے۔ اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے
اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر
اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری
عفو کو شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلند
ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے
حکم ہوتا ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دو
گنہگاروں پر ترس نہ آئے اگر تم کو

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ (النور ۲) پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارشیں پہنچائیں تو فرمایا "اے لوگو! تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا[1]۔"

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے[2] تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو"۔ یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے آپ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا[3]"۔ یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرِ تاوان یا خونبہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا "آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی[4]"۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۳۔ [2] بخاری کتاب الحدود۔ [3] ابوداؤد و نسائی، کتاب الدیات۔ [4] ابوداؤد کتاب الحدود۔

Marfat.com

یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی وہ پکڑا گیا اور عدالتِ نبوی میں پیش کیا گیا۔ آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں"۔ فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں یہ کر لیا"۔[1]

یہ تو اُس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے۔ اور اس لحاظ سے قانونِ محمدی موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے۔ لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے

عفو و درگذر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس کو نہایت شاق گذرتی ہے وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے۔ لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدا تعالےٰ کی توحید اور عظمت جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اُس نے پیش کیا ہے جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے۔ تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ   اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود۔

Marfat.com

دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۰۸)

ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی نمایاں تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور ل کوج پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ○ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ (الاعراف: ۱۹۹-۲۰۰)

معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر۔ اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھارے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ وہ سنتا جانتا۔

سکون کی حالت میں عفو و درگزر آسان ہے مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔ صحابہ کی تعریف میں فرمایا:

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ○ (الشوریٰ: ۳۷)

اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○ (آل عمران: ۱۳۴)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (الشوریٰ: ۴۳)	اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدیؐ نے اپنے الفاظ میں عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاء اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: ۳۵)	اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنا چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ فرمایا:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ	اچھی بات بتا اور بری بات سے روک
وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ	اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے
مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (لقمان: ۱۷)	کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوییوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔ فرمایا:

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ	اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو
مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (آل عمران: ۱۸۶)	تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور ا

Marfat.com

ی کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھیے کہ حسبِ ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی ف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ	(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ کہ اُن کو جو ایام اللہ کی اُمید نہیں رکھتے
(الجاثیۃ: ۱۴)	معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو اُمید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر و مشرک ہیں۔ اب دیکھیے کہ کافر و مشرک کے خلافِ اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس وجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے رکریں۔ کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ جائز ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب طر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر اُن کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○	اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرد یا چھپا کر کرو یا کسی بُرائی کو معاف کرد (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا
(النساء: ۱۴۹)	معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ تا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت مطلق الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو ف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی

Marfat.com

اور درماندگی ظاہر ہے اُس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہیے۔ اسی کے قریب تر

آیتِ پاک بھی ہے:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ	اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگذر
أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ	کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو
رَّحِيمٌ ○ (النور ۲۲)	معاف کرے۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی تم دُوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا۔ اس میں عفو و درگذر کی

عظیم الشان ترغیب ہے۔

بُرائی کی جگہ نیکی

عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو بُرائی کرے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو۔ اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے:

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ	نیکی اور بدی برابر نہیں۔ تو بُرائی کا
ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي	جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ	جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے
حَمِيمٌ ○ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ	وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار
صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ	دوست اور یہ بات اُنہی کو حاصل ہوتی
عَظِيمٍ ○	ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں
(حٰم السجدۃ: ۳۴-۳۵)	اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

Marfat.com

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے اس کی
ں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو
دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے اگر ایسا موقع پیش
تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ (المؤمنون: ۹۶-۹۷)	مشرکوں کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دے ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ اور کہہ کہ اے میرے پروردگار میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان
ں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر
خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ	اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے

Marfat.com

يَدۡرَءُونَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عُقۡبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدۡنٍ (الرعد: ۲۱-۲۳)	ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔ ہمیشہ رہنے کے باغ

اُن سے کہا جائے گا :

سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ۝ (الرعد: ۲۴)	تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت عظمیٰ میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا نہ خوف خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ بُرائی کے بدلے نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنے ہم قوموں سے دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے: کہ وہ بُرائی کی جگہ بھلائی کا

أُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ أَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ أَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا لَنَآ أَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ أَعۡمَالُكُمۡ	وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں۔ اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں تو اس سے درگذر

سلٰمٌ عَلَیکُم لَا نَبتَغِی الجٰھِلِینَ○ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے
لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے
تمہارے کام، سلامت رہو ہم کو بے
سمجھوں سے مطلب نہیں۔ (القصص، ۵۴-۵۵)

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجیے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ
ـے ہیں اور درگذر کرتے ہیں بلکہ اُن کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔
صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قرابت کا حق ادا کرنے والا
ـیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو"[1]
ـ دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ "اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ
ـ سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں،
ـلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا "اگر ایسا
ـہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو" یعنی نیکی کے لقمہ سے اُن کے منہ بند
ـرہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے خدا کی مدد شامل رہے گی۔"[2] حذیفہ رضی
ـے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو۔ تم کہتے ہو کہ اگر لوگ
ـرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے۔ یہ
ـیں بلکہ اپنے کو پُرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر
ـائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو۔"[3]

---

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلہ۔ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلہ۔ [3] جامع ترمذی کتا
ـبر والصلہ صفحہ ۳۲۴ (غریب)۔

Marfat.com

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کا معاہدوں، اور پر فریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (المائدۃ:۱۳)

اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے۔ تو تو ان کو معاف کر، اور ان کے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصوروں سے درگذر کرنا اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار و محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

Marfat.com

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں اُن کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول
میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اُس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت میں
ں کے نفاذ میں اُن وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس
تمام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی اُن کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا لیکن وحشت
زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے
ت پر نظر نہیں کی جاتی۔ ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ
ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے لیکن اس جرم
کی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا
جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات
راغ دیتے ہیں، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال تمدنی نظامِ حکومت کو
غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو
ت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔ تمدن
زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

Marfat.com

تفصیل اور ہمہ گیری مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے اسی کو مختلف کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذا اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں میں جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں اُن کی ترغیب دی لیکن امر و نہی کے طریقے او کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم ا کر دیا ہے اس بنا پر جس طرح اُس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے جس سے برا تمام تر سدِ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین ا تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں ک کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے اس کا ایک سبب اس ک کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جا کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اس ک دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت ناکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا امّ الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ

Marfat.com

کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کرسکتی تھیں تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے۔ اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برسرِ منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

لاتطرونی کما اطرت النصارٰی	میری شان میں مبالغہ نہ کرو جس
ابن مریم فانما انا عبدہٗ	طرح نصاریٰ نے ابنِ مریم کی شان
فقولوا عبد اللہ و رسولہ۔	میں کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں تو کہو کہ
(بخاری، کتاب الانبیاء)	خدا کا بندہ اور رسول۔

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی۔ اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی۔ یہی حال عبادات کا بھی ہے اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کی اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے۔ اخلاق کی تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لئے باقی نہیں رکھی یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے،

۱. تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲. ہر برائی اور بھلائی کی ساری جزئیات کا احاطہ۔

۳. نرمی و گرمی، عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلّمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے۔ اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے۔ ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے۔ باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ (دیکھو خروج باب ۲۰)

توراۃ کے اخلاقی احکام ۱. تو اپنی ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲. تو خون مت کر۔

۳. تو زنا مت کر۔

۴. تو چوری مت کر۔

۵. تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶. تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے

گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے۔ اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت۔ پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسبِ ذیل مزید تفصیل ہے:

۱. تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

۲. تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳. تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴. تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر۔ نہ اس سے کچھ چھین لے۔ مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵. تو بہرے کو مت کوس۔ تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶. تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷. تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸. تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹. تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ۔

۱۰. تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے اُٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزّت دے۔

۱۱. اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے تم اس کو مت ستاؤ بلکہ مسافر

Marfat.com

کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ جو تم میں پیدا ہوا ہے بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنیٰ اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے اخلاق میں بھی جھلکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے؛ ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا۔ اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں،

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بُردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

Marfat.com

لام میں اخلاقی احکام کا استقصا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی قوم یا زمانہ تک محدود نہیں اس لئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا۔ لئے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں ان سب کو استقصا کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کید کی گئی۔ گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی آنحضرت اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک نے اُن کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول وشن کر دیا۔ ذیل میں ہم اُن اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ت قرآن پاک نے کی ہے۔

انی اخلاق کی فہرست سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگزر ، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی ، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ سان، فخر و غرور کی بُرائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، قہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو بُرا بھلا نا، کسی کو نہ چڑانا، نہ بُرے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی سلامتی کی دُعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی دری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں

Marfat.com

کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بُری بات سے روکنا، اولاد کُشی، خودکُشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے
کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول
میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھ
نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی بُرائی، آنکھ، کان
اور دل کی بازپُرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں
کو معاف کرنا، دُشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی بُرائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو
میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو بُرا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل و انصاف، دُشمنوں تک سے
عدل و انصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی بُرائی، الاہنے کی مذمت، فسق
سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت،
کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی بُرائی، رفتار میں وقار و متانت، مجالس میں حُسنِ اخلاق، ضعیفوں
کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی
چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرم
کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی
کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود
رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان
سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی بُرائی، شراب پینے اور جُوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں
کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت
سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رُخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو نیکی
پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانت داری۔

حادیث کے اخلاقیات کی فہرست | یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآنِ پاک ہے۔ ان
ے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال میں ہے جو اُن کی
فسیر و تشریح ہیں احادیث میں مذکور ہیں۔ اُن کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں
ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ
ے بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۲ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے
ین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں۔
ہیں بعض مکرّر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہو گا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا
ئی ایسا جزنہ ہو گا جو داعیٔ اسلام علیہ السّلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دُنیا کے
ا سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلّم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ
یہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی
اؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی، ماں باپ کیساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی
اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و
یال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام
سانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں
ا خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں
ا خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت
بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی بُرائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام
نا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصّہ کو

Marfat.com

ضبط کرنا، عفو و درگذر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسروں کے گھر جاکر اِدھر اُدھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لئے پیٹھ دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی مما دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچ ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصا تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ما ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگ کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ منافقت اور دورُخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شرا زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، معانقہ، دیگر آداب ملاقات، آداب مجلس، آداب طعام، آداب لباس، آداب نشست و برخاست، خانہ داری کے آ سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔ ان تفصیلا سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرلے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا اخلاقی

Marfat.com

کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور اُن کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی توضیح کے لئے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جز کی تفصیل کر دی۔ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے شریعت محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی۔ وہ اجناس مقرر کر دیئے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، اُن کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی۔ اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا،

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ: ۲۱۹)	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو تو یہ تمہارے کمالِ خُلق کی دلیل ہے۔ انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں اُن کی تعریف میں خدا نے فرمایا؛

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ (الحشر: ۹)	وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اُن کو حاجت ہو۔

Marfat.com

صحابہ کی مدح میں فرمایا:

یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ○

(الدھر: ۸)

خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خُدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔ اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآنِ پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے، جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دناءت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ○

(آلِ عمران: ۹۲)

تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو جو تم کو محبوب ہے۔ اور جو بھی تم خرچ کرو، خدا کو اس کا علم ہے۔

پھر فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ○

(البقرۃ: ۲۶۷)

اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو اُس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو اور اُس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

Marfat.com

اس آیتِ پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے" یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے کہ وہ تو ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات
اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ	کریں؟ کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	کرو وہ ماں باپ، رشتہ داروں،
وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ	یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لئے۔
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○	اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اُس
(البقرة: ۲۱۵)	سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے" لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فرمایا "مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے" صحابہ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو؟ فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے۔ یہ بھی صدقہ ہے[1]" دوسرے موقع پر

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقہ ص ۶۴ مصر۔

Marfat.com

فرمایا: "اچھی بات کہنا اور بُری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے[1]"۔ غور کیجیے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اس پر جتاؤ، نہ اُس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا۔ فرمایا:

وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ۝ (المدثر: ٦)

اور اپنا احسان نہ جتا کر تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (البقرة: ٢٦٤)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝ (البقرة: ٢٦٣)

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اُس خیرات سے بہتر جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار۔

---

[1] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب صنائع المعروف۔

ریا اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (البقرة: ۲۷۱)	اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے! اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرة: ۲۷۴)	جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ نہ ان کو خوف ہو گا اور نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہیئے جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے:

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○ (التوبة: ۵۴)	اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کراہ کر۔

صدقہ و خیرات پکے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے

Marfat.com

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ (البقرۃ: ۲۶۵) — خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو:

وَمَا تُنْفِقُونَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝ (البقرۃ: ۲۷۲) — اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔ اور جو خیرات کرو گے وہ تم کو پوری ملے گی تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ و خیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہو گا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ | ان احکام میں وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے گو اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارے میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا۔ اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی۔ ان کے ذریعے سے تمام دنیا کو اس کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے۔ ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ — آپ نے فرمایا خدا شراب پر، اس کے

سلم لعن اللّٰہ الخمر وشاربھا و ساقیھا وبائعھا ومبتاعھا و عاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولة الیہ۔

(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)

پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے۔ عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعیین فرمادی:

قال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ و سلم ان من العنب خمرا و ان من التمر خمرا و ان من العسل خمرا و ان من البر خمرا و ان من الشعیر خمرا۔

(ابوداؤد، کتاب الاشربہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی، اور جو سے بھی۔

قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ان الخمر من

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شراب

العصیر والزبیب والتمر و — انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جَو، جوار
الحنطۃ والشعیر والذرۃ وانی — اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے۔
انھاکم عن کل مسکر۔ — اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ) — منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دُنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدیداً ان کو شامل نہ ہو۔ اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی:

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ — ہر نشہ آور چیز شراب ہے
(ابوداؤد: کتاب الاشربۃ۔ وصحیح مسلم و احمد و ترمذی و نسائی) — اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

کل شراب اسکر فھو حرام۔ — ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ
(ابوداؤد، احمد و بخاری و مسلم) — حرام ہے۔

لیکن حیلہ جُو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جا[ئے] کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا:

ما اسکر کثیرۃ فقلیلہ حرام۔ — جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ) — کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر[تی]

Marfat.com

ہو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے۔ بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب
بلکہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی
ت فرمائی۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم عن کل مسکر و مفتر۔
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر منشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں
ہر فاخمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جس کو داذی کہتے تھے۔
ہر آپ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

یقول یشربن ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا۔
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں آن کے استعمال کی بھی
ت فرمائی:

نھی عن الدباء والحنتم والمزفت والنقیر۔
(ابوداؤد، کتاب الاشربہ)

آپ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا۔
رف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے
نت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صورتوں

Marfat.com

میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی حرمتِ خمر کے وہ بے کار چیز ہو گئی۔ حضرت ابو طلحہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ جائے لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی۔[1]

ایک بار دیلم حمیری نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے اس لئے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے۔ آپؐ نے ف اس سے نشہ بھی ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا "تو اس کو چھوڑ دو"۔ انہوں نے کہا "لیکن اور لوگ چھوڑیں گے" ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو۔"[2]

سُود کی حُرمت میں جزئیات کا احاطہ اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھ سے سود لینے کی ممانعت کی تھی انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے تاہم یہ ممانعت بہت مجمل اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کی اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز اس کی پوری تفصیل کی۔ اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی ش ہوں ان سب کو شریکِ جرم ٹھہرایا؛

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم آکل الربٰو وموکلہ وشاھدہ وکاتبہ (ابوداؤد، کتاب البیوع)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے وا سود کھلانے والے اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حُرمت میں استقصاء

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔ اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

[2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔

Marfat.com

الراشی والمرتشی   دینے والے اور رشوت لینے والے

(ابوداؤد، باب فی کراھیۃ الرشوۃ)   دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصار اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ...یونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر ...ی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا ...لع وقمع نہیں ہو سکتا۔

...م وگرم اخلاق | مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دُنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس ...ین اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم میں کر دیا تھا یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی ...ی، بُردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی ...توہین کی تھی۔ حالانکہ دُنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لئے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے ...ج کی ضرورت ہے۔ جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے ...پر خودداری اور عزّتِ نفس کی حاجت ہے۔ جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور ...ب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے۔ محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لئے ضروری ...کمرانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

...ٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر | جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا وبے جا اعتراضات کے جو ...برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے وہ اسی لئے ہے کہ وہ ...ت کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ ...عزّتِ نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کہتا ہے:

مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے۔ مسیحیت نے

Marfat.com

طبائع انسانی کی تمام خود دارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا اپنا مسلک قرار دیا ہے مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے[1]۔

اسلامی اخلاق کا اعتدال لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۰ برس بعد آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی۔ مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اس تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو۔ تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسا یکساں نہیں ہیں۔ انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متو ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضب ناک بھی، بخیل بھی فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پُرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قو بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی۔ الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف اور مراتب ہیں کہ سب کے لئے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہو سکتی بہترین اخلاقی معالج وہ ہے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسبِ ضرورت اصلاح صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص

---

[1] نطشے از ایم اے مگے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے، باب سوم۔

Marfat.com

قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے۔ وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق غصب نہ کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے وہ خدا سے مل رہا ہے۔ وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے خدا سے مانگنے والا کر دے۔ وہ ذلیل و خوار کو خود دار اور خود دار کو غیر مغرور بنا دے۔ وہ اچھی قوتوں کو نشوونما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قوتِ غضب اور قوتِ شہوت میں تعدیل قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے۔ قوتِ غضب اور قوتِ شہوت۔ غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا۔ ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھی بری اخلاقی جزئیات پیدا ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبۂ حق، جدوجہد، سعی و محنت، جہاد۔ پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دناءت کے قالب میں ظہور کرتی ہے۔ اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفت کہتے ہیں۔ یہ عفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری

Marfat.com

جود وسخا، شرم و حیا، صبر و شکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ۔ پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس سے حرص و طمع، بزدلی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہ بُری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بُری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل بُرا ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو" اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گزارو بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انہیں ہدایت ملے اور خدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے بکلف اٹھاؤ لیکن شریعت کی مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو۔ امام غزالیؒ کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہا ہے وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں دُنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی جو کچھ ہے وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں سو اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دُنیا مر جائے۔ نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن و امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور خدا کی یہ دُنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس

حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفسِ غصہ اور خواہش بُری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ کرنا ناجائز خواہش بُری چیز ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بُری چیزیں ہیں اسی طرح وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلّت پسندی، دنارت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، مستی، فاقہ زدگی بھی بُرے ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں ان کو رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (آپس میں رحم دل) اور اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی وہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ (کافروں پر بھاری) اور اَعِزَّةٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ (کافروں پر گراں بننے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے، وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے۔۔۔۔ اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقیِ تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ یہ خانقاہانہ طرزِ زندگی کا مثل ہے۔ فوجی طرزِ زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دیا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمح نظر تھا کسی طرح ترقیٔ تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو

جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متأخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری۔ انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اُن کے بجائے دنارت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اوّل الذکر میں سیاسی حرّیت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں اُن سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔ (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق لیکن اس کے بالمقابل معلّم اسلام علیہ السّلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندا آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

ان اللہ یحب معالی الامور و	بے شک اللہ معالی امور کو پسند اور
یبغض سفسافہا۔ (مستدرک حاکم)	محقّرات امور کو ناپسند کرتا ہے۔

معالی امور سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقّرات سے مراد چھوٹی اور دُنی باتیں ہیں ا حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنارت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

المؤمن القویّ خیر واحبّ الی	کمزور مسلمان سے قوّت ور مسلمان زیادہ
اللہ من المؤمن الضّعیف و فی	بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے۔
کلّ خیر احرص علی ماینفعک	اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ ہر وہ چیز
واستعن باللہ ولا تعجز وان	جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش

اصابك شئ فلا تقل لو انّى	کر اور خدا سے مدد چاہ۔ اس راہ میں کمزوری
فعلت كان كذا وكذا ولكن قل	نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ
قدر الله وما شاء فعل فانّ لو	جائے تو یہ نہ کہہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا"؛
تفتح عمل الشيطان۔	بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور جو چاہا
(صحیح مسلم: کتاب القدر، باب فی الامر	اس نے کیا کیوں کہ یہ اگر داور مگر) شیطان
بالقوه)	کا کاروبار کھولتا ہے۔

ریر، توکّل، صبر اور شکر یہ حدیث اُن تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر ا، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادت کے تحتِ عنوان جلد پنجم میں کی جاچکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں حوصلہ مندی، پُرامیدی، استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو۔ مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ا چاہیئے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکّل کرکے کام شروع کر دینا چاہیئے۔ کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خُدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اس ے فضل و کرم سے ہوا۔ اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور نا اُمیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیئے ر سمجھنا چاہیئے کہ خدا کا منشا یہی تھا (یہی تقدیر ہے)۔

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآنِ پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ	جب تو پکّا ارادہ کرلے پھر خدا پر بھروسہ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ	کر بے شک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے۔
يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ	اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر
اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِىْ	غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے

Marfat.com

يَنصُرُكُم مِّنۢ بَعۡدِهِۦۗ وَعَلَى ٱللَّهِ	تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد
فَلۡيَتَوَكَّلِ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ ○	کرسکتا ہے خدا ہی پر ایمان والوں کو
(آل عمران: ۱۵۹-۱۶۰)	بھروسہ کرنا چاہیے۔
مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٖ فِي ٱلۡأَرۡضِ	کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر
وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ إِلَّا فِي كِتَٰبٖ	لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے
مِّن قَبۡلِ أَن نَّبۡرَأَهَآۚ إِنَّ ذَٰلِكَ	پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے۔
عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٞ ○ لِّكَيۡلَا تَأۡسَوۡاْ	یہ اللہ پر آسان ہے۔ یہ اس لئے
عَلَىٰ مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُواْ بِمَآ	تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو
ءَاتَىٰكُمۡۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٖ	اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ
فَخُورٍ ○	کرو۔ اللہ کسی اترانے والے،
(الحدید: ۲۲-۲۳)	بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ ان کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرٗا وَثَبِّتۡ	اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر وثبات کا
أَقۡدَامَنَا وَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ	پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ
ٱلۡكَٰفِرِينَ ○ (البقرۃ: ۲۵۰)	اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا۔

Marfat.com

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۴۶-۱۴۷)	اور کتنے نبی تھے کہ اُن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے۔ اور خدا ثابت قدم رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے۔ اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔

پر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران: ۲۰۰)	اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رُعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں کو پیار کرو | مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زرّیں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں

کو پیار کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں چ
جاتی ہیں لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود انجیل کے مفسروںؔ
اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے۔ تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو۔ دشمن کے
دعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدیؐ نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی جن پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بن
نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے۔ یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، ج
بددعائیں دیں ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو! خدا کے لئے کھڑے ہو
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز	جایا کرو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى	قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے
اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ	باز نہ رکھے انصاف کرو کہ انصاف کرنا
لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا
خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدۃ: ۸)	سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ	اور بھلائی اور برائی برابر نہیں۔ برائی کو بھلائی
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا	سے دفع کرو، تو دفعتہً وہ جس کے اور تمہارے
الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ	درمیان دشمنی ہے، رشتہ دار دوست
وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ○ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا	کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا	توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں او

ؔ اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ	انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت
مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ	والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو
بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝	خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے
(حٰمٓ السجدۃ: ۳۴-۳۶)	والا ہے۔

۱. اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور بُرائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲. اس آیتِ پاک میں جس نیکی اور حُسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ اُن لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دُشمن ہیں کیوں کہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دُشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳. دُشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے۔

۴. دُشمن کے ساتھ بُرائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عباسؓ جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں[۱]:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی بُرائی کرنے پر حلم اور عفو و درگذر کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسا کریں گے تو خدا اُن کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور اُن کا دُشمن بھی دوست کی طرح اُن کے آگے سر جھکا دے گا۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے گالی دی۔

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۱۲، و ابن جریر جلد ۲۴ ص ۶۸ مصر۔

Marfat.com

وہ سن کر چپ رہے۔اس نے دوبارہ وہی حرکت کی وہ پھر بھی چپ رہے۔اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی تو وہ
نہ رہ سکے اور کچھ بول اُٹھے۔یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اُٹھ گئے۔حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول
کیا آپؐ مجھ سے خفا ہوئے؟ فرمایا" اے ابوبکرؓ جب تک تم چپ تھے خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کہتا
جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔[1]

آپؐ نے فرمایا"صلۂ رحم یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو بلکہ یہ ہے کہ جو قطع
کرے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔"[2] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ
اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبویؐ میں آکر عرض کی یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتایئے جس کے
سے جنت مل جائے۔آپؐ نے اس کو چند باتیں بتائیں منجملہ ان کے فرمایا"ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی
کردو۔"[3]

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دشمن نہیں ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآنِ پاک مسلمان
کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ	(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان
لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا	کو جو خدا کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے،
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○	معاف کر دیا کریں تاکہ خدا ایسے لوگوں کو ان
(الجاثیۃ:۱۴)	کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیوں اور سانپوں اور سانپوں کے بچوں"[4] والی مسیحیت

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی الانتصار [2] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۸۸۶۔

[3] مستدرک حاکم کتاب المکاتب، جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ حیدر آباد دکن [4] انجیل متی ۲۳، ۲۵، ۳۳۔

Marfat.com

ں نہیں بلکہ اسلام کے اُس اوّلین داعی و واعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر
ن کر نہیں، بیک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا
ہ چکا تھا،[1] جس نے اس کو معاف کیا جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا اشتہار و انعام
س کا تعاقب کیا تھا،[2] جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا،[3] جس نے اپنے چچا
ل کو معاف کیا تھا،[4] جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور اُن کے جگر کو چبانے والی کو معاف
ں نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا،[6] جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار
کو معاف کیا[7] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا
ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پاکر معاف کیا،[8] جس نے اُن طائف والوں کے حق میں دعائے[9] خیر کی جنہوں
ں پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے اُحد کے میدان
پنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دُعا دی،[10] جس نے دشمنوں کے حق میں بد دُعا کرانے والوں کو کہا کہ
نیا میں لعنت کے لئے نہیں بلکہ رحمت کے لئے آیا ہوں[11] صلی اللہ علیہ وسلم۔ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین
ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ	لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ	پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ

---

[1] صحیح بخاری باب فتح مکہ [2] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ [3] صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی [4] صحیح بخاری فتح طائف [5] صحیح بخاری باب فتح مکہ [6] کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ ہبار بن اسود [7] جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح صفحہ ۵۰۴ [8] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۴۰۸ [9] ابن سعد غزوۂ طائف [10] فتح الباری ج ۷ صفحہ ۲۸۶ مصر باب اُحد [11] صحیح بخاری بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مشکوٰۃ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم۔

Marfat.com

شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ | تمہارے خلاف کسی کی مدد کی توان کا عہد
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ | ان کی مدتِ مقررتک پورا کرو، اللہ پرہیزگاروں
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ | کو دوست رکھتا ہے۔
الْمُتَّقِيْنَ ۝ (التوبة: ۴)

کفار ومشرکین سے عدمِ موالات اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے اُن احکام کو پیش کر
جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ بالکل
ہے یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام وبقا اور حفاظت کی خا
تحریک کے پیرووں کو اس کے اُن مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے
سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہوں خصوصاً ایسے وقت میں جب اس
تیغ وخنجر اور فوج ولشکر سے مٹادینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حا
ہو یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیرووں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس قسم کی

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ | ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو
اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ | اپنا دوست نہ بنائیں توجو ایسا کرے گا
مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ | تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں مگر
فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ | کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔
تُقٰىةً ۭ (آل عمران: ۲۸)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا | اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائی
اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ | کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ | محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ میں سے جو کوئی اُن سے دوستی رکھے گا تو
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (التوبة : ٢٣) وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔

ہی موقع کی ہیں۔ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی
اطر جس قدر محبت ہوگی فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لئے
ٹی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں لہٰذا اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات
سے اسلام نے روکا ہے۔اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو "شہزادۂ امن" کے اس اعلان کے ہیں:

"یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا۔صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں۔
کیوں کہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اُس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے
جُدا کروں۔آدمی کے دُشمن اُس کے گھر کے لوگ ہوں گے۔جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ
چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں"۔(متی کی انجیل باب ١٠-٢٤)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ
تھی جو دوسرے نادان بُت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی۔وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ
سے خطاب کرتے تھے۔جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ شام کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی جنگ چھیڑی اور
بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے اُن کا پلّہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر
آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دُوراندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام
کے ان دُشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔اسی
کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے
اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا۔فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں

Marfat.com

الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى
الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى
اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ
فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ
اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لا
اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ط حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ
فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ
يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ز

(المآئدة: ۵۱-۵۴)

کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے
کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے اُن سے
رفاقت کرے، وہ ان ہی میں ہے۔ اللہ
بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔ اب تو
ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے
کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں کہتے
ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ
آجائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی)
فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات
اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی
چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں
کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے
تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں خراب گئے
اُن کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں۔ اے
ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے
پھرے گا تو خدا کا کچھ حرج نہیں اللہ اپنے
دین کے لئے اور دوسرے لوگوں کو لائے
گا جن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں
گے جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری
ہوں گے۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور کفار میں سے اُن کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو۔

(المآئدۃ: ۵۷)

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیقِ کار، محرمِ اسرار اور مددگار بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آلِ عمران کی اس آیت میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (آل عمرٰن: ۱۱۸)

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے۔ جتنی تم کو تکلیف پہنچے اُن کو خوشی ہے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو اُن کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے۔ ہم نے تم کو باتیں جتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جس کی روک تھام کے لئے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے۔ سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے۔ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں

Marfat.com

عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ
كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ
يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ
خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ تُسِرُّوْنَ
اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ
بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَ
مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ
يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا
اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ
بِالسُّوْۗءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ۭ
لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ
اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

(الممتحنة: ۱-۳)

کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام
بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر
ہیں۔ وہ رسول کو اور تم کو اس لئے گھر سے
نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر
ایمان لے آئے۔ اگر تم میری راہ میں لڑائی
اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم
اُن کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے
خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم
ظاہر کرتے ہو۔ جو تم میں سے ایسا کرتا ہے
وہ سیدھی راہ بھولا ہے۔ اگر وہ (جن کو تم
دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے
پائیں تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہاری
تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائیں
اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور
چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر
ہو جاؤ۔ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری
اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیئے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ

خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور

يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ	انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم
يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ	سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ
تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ	تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں۔ خدا
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝	انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔ وہ انہی
اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے
قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ	مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى	گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے
اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ	پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ جو ان
يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝	سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف
(الممتحنة: ۸-۹)	ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوش خبری بھی سنادی کہ عنقریب تمہاری فتح ہو گی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ	امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے
بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ	دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے
مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ (الممتحنة: ۷)	اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطب رضی بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

Marfat.com

دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں۔ وہ خط آیا تو آپؐ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی "یا رسول اللہؐ! جلدی نہ فرمائیے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں وہاں اُن کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں۔ میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں۔ میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا" آپؐ نے فرمایا "تم بدر والے لوگ ہو، خدا نے تمہارے گناہ معاف کئے ہیں"۔ اس پر یہ آیت اُتری: یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دُشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہدِ عتیق میں بھی مذکور ہیں۔ زبور میں ہے:

"اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں تیرے دُشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں۔ اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا جو تیرا کینہ رکھتے ہیں؟ کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں بیزار نہیں؟ میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے دُشمنوں میں گنتا ہوں"۔ (۱۳۹ - ۱۹ - ۲۲)۔

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

"اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیّہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا بلکہ وہ تمہارے لئے پھندے اور دام اور تمہاری بغلوں کے لئے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

Marfat.com

ہوں گے یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے نابود ہو جاؤ گے۔ (یشوع باب ۲۳۔ ۱۲)

قرآنِ پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (النساء: ۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانعام: ۶۸)

اور جب تو اُن کو دیکھے کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں تو اُن سے کنارہ کرلے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں۔ اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (النساء: ۱۴۰)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

Marfat.com

یہ احکام اس لئے ہیں تاکہ بُری صحبت کا بُرا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے۔ ان کے معنی قریب قریب ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

"میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو لیکن نہ یہ کہ بالکل دُنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بُت پرستوں سے نہ ملو، نہیں تو تمہیں دُنیا سے نکلنا ضرور ہوتا۔ پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی یا بُت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا..... غرض کہ تم اس بُرے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو۔" (اول قرنیتون ۵)

"اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جُتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کون سا ساجھا ہے۔ اور روشنی اور تاریکی میں کون سا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصّہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے!...... اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم اُن کے درمیان سے نکل آؤ اور جُدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ۔" (دوم قرنیتون ۶)

کفّار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو اُن سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے۔ عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۶)	اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے یہ اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حُسنِ سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآنِ پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی اُن کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے۔ فرمایا:

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي	اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد
مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر
وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا	جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان
وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ	اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر
إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ	اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا پھر
تَعْمَلُونَ ○	تم سب کو میری طرف آنا ہے پھر میں تم کو جتاؤنگا
(لقمان: ۱۵)	جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں "منافقین" کہتے ہیں بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلیں یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت

Marfat.com

سے باز آجائیں۔ ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے۔ اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

(التوبۃ: ۷۳-۷۴)

اے پیغمبر اُن کافروں اور منافقوں سے جہاد کرا ور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بُری بازگشت کی جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پاسکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسُول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کردیا۔ تو اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ اُن کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے اور آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانو

Marfat.com

کورومیوں کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○ (التوبة: ۱۲۳)

اے ایمان والو! اُن کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر اُن پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیتِ نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ (التحریم: ۹)

اے پیغمبر! اُن کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بُری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہیں جو اس انتظام اور نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگ دلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں۔ اور وہ سورہ فتح کی حسبِ ذیل آیت ہے جس میں ایک

لہ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰ صفحہ ۴۶، مصر۔

طرف صحابہ کی بہادری اور دوسری طرف اُن کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۲۹)

محمد خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار اُن سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان اُن پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی اُن پر غالب اور اُن کے مقابلہ میں کافی مضبوط ہیں اُن سے کسی طرح دبتے نہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (المائدۃ: ۵۴)

فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے:

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ (ھود: ۹۲)

اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

Marfat.com

عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ (التوبۃ: ۱۲۸) تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے:

ورجل شدید قویّ والجمع اشدّآء[1] مردِ شدید یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّۃً۔ اَشَدُّ خَلْقًا۔ اَشَدُّ تَثْبِیْتًا۔ اَشَدُّ مِنْھُمْ بَطْشًا غیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے شتقات میں بھی یہ معنی مراد لیئے گئے ہیں:

اُشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ○ (طٰہٰ: ۳۱) اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔

وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا○ (النبا: ۲) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

وَشَدَدْنَا مُلْکَہٗ (ص: ۲۰) اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی۔

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (محمد: ۴) پھر مضبوط باندھو۔

شَدِیْد کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلے میں مضبوط اور سخت رہے۔ اور یہی صحابۂ کرام کی صفت تھی۔ انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پُر زور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔ اُن کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی۔ اُن کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہو لہان ہوئے۔ مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے پھر اُس سے انکار نہ کیا۔ آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اُن سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رُعب اُن پر بیٹھ گیا۔ قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران والانفال) میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب

---

[1] ۔۔۔ ۴ صفحہ ۲۱۸ مصر۔

ہمارا دوں گا وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (الاحزاب والحشر)

"اُن کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب ڈال دیا۔"

مخالفوں کے دلوں میں اسی رُعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ

جنگ مہیار کھنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (الانفال)

اُن کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دُشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دُشمن تمہارے مقابل آنے سے رُعب کھائے اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے "جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اُس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے جو اپنی ضرورت کے لئے باندھتا ہے اس کے لئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لئے باندھتا ہے وہ اس کے لئے عذاب ہے"۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے دشمنوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قومی عداوت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرؤوں کو نہیں روکا ہے۔

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا لیکن ایسا کرنا فطرت کے قوانین

لہ صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

چشم پوشی کرنا ہے۔ محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دُنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جد وجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں۔ اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے برف کا تودہ بن جائے۔ اس لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس سے غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو۔ صلح و جنگ، دوستی و دشمنی، رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لئے ہو۔ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوش نما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا۔ وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہو گا۔ وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہو گا۔ مومن سے خوش ہو گا تو منافق سے ناخوش بھی ہو گا۔ انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی جیسا کہ قرآن نے کہا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ (الاحزاب:۴) — خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (متی ۶۔ ۲۴)۔

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ پولوس نے خدا اور آدمی، یعقوبؑ نے خدا اور دنیا، یوحناؑ نے خدا اور دنیا کے بُرے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے اپنی ذات کے لئے نہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے پوچھا "ایمان کی کون سی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟" عرض کی "خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے"۔ فرمایا "یہ کہ باہم میل جول خدا میں ہو محبت بھی خدا ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی میں ہو"۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت کیا کہ کون سی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے؟ کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپؐ نے فرمایا "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا ہی کے لئے محبت اور خدا ہی کے لئے مخالفت ہو"۔

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخا...

۱؎ گلیتون کے نام ۵۔ ۱۰۔ ۲؎ یعقوب ۴۔ ۴۔ ۳؎ یوحنا ۲۔ ۱۵۔ ۴؎ مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ۔

رضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض وغایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو۔ نیز یہ کہ شخص سے حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا ری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ قرآن کی ایک آیت ہے:

حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ

(الحجرات: ۷)

خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور ، فجور اور عصیاں کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری نامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے۔ یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے۔ رمایا:

فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ؕ

(التوبۃ: ۱۱)

تو اگر وہ کفر سے توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہ کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور نامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کا وجود نہیں۔ نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے نہ ملیچھ ہے نہ چنڈال یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد

Marfat.com

اور بد گہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے
کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے۔ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب
ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی مومن و موحد ہو کر بلالؓ حبشی، صہیبؓ رومی اور سلمانؓ فارسی کا
پا سکتا ہے۔ وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت
دشمن تھے بیک نظر اُن کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان اُن کے فدائی بن
اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج (آل عمران: ۱۰۳)	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیاں کاری ہے
توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے۔ بشیر عالم آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگاروں کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (الزمر: ۵۳)	اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ خدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ[1] گناہ سے توبہ کرنے والا

---

[1] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔

بلا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو"۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گنہگاروں کے ساتھ بھی
قت فرمائی اور اُن کی طرف ترحّم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سُنائی۔ ایک صاحب
راب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے
ابہ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سُنے
رمایا تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو خُدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خُدا اور اُس کے
ل کو پیار کرتا ہے"[1]۔ اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گناہگار پر بد دُعا نہ کی جائے[2]۔ ماعزؓ
مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے۔ واقعہ کے بعد ان کا روحانی
اس بیدار ہوا وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے تاہم انہوں نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر اپنی
ت عرض کی اور سزا کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ اُن کی درخواست رد کی،
ن سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں۔ سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے۔ اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔
یدان میں کھڑے کیے گئے اور اُن پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی اور اسی حال میں انہوں نے
ادی۔ صحابہ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعزؓ کو بُرا کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ
م کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعزؓ کے لئے خُدا سے مغفرت کی دُعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم
بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے"[3]۔

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست
آپؐ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا وہ اس کے بعد آئی۔ فرمایا بچہ کی پرورش کر لو جب بچہ دودھ
ڑ دے تب آنا۔ وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساس
کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود۔ [2] فتح الباری شرح حدیث مذکور۔ [3] صحیح مسلم کتاب الحدود۔

Marfat.com

کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے منہ پر پڑیں انہوں نے عورت کو بُرا کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا کہ "خالد چپ رہو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔"[1]

ترکِ ہویٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے تو وہ نیکی نہیں فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآنِ پاک میں **ھویٰ** ہے ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اخلاق کو ہویٰ سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لئے وہ کام کرتا ہے اسی لئے اللہ نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بُنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا مذہب اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور اُن کے سینوں کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش و ہویٰ کے بت چُھپے ہیں۔ قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں تنبیہ کیا:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الجاثیۃ: ۲۳)

اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے

اسی لئے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعتِ محمدیؐ نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بُری خواہش سے پاک ہو جائے کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بُری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی اسی لئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بُری خواہش، ہر باطل غرض، ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے۔ وحی محمدیؐ نے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحدود۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص: ۵۰)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص: ۲۶)

اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کرو وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اس ہویٰ کے زہرِ قاتل سے مر جاتی ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (النسآء: ۱۳۵)

عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے۔ فرمایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النازعات: ۴۰-۴۱)

اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبتِ الٰہی دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر ضروریاتِ دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے۔ عقائد کے باب میں محبتِ الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے۔ للہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو تورات اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے

Marfat.com

اور یہ دولت انسان کو کیوں کر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر میں داعیٔ خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ — کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔
(آل عمران: ۳۱)

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآنِ پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اصول اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں میں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں حسنِ خلق بھی ہے۔ ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسبِ ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۶۸) — اور خدا ایمان والوں کا دوست ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ — خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(البقرۃ: ۱۹۵/ المائدۃ: ۱۳)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (البقرۃ: ۲۲۲) — خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ — خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(آل عمران: ۱۵۹)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ — خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(المائدۃ: ۴۲/ الحجرات: ۹)

Marfat.com

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبة: ۴)	خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۴۶)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبة: ۱۰۸)	اور خدا پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (الصف: ۴)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیاتِ پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسبِ ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۳۲)	تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (البقرة: ۱۹۰/ المائدة: ۸۷)	خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ (النساء: ۳۶)	خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيْمًا ○ (النساء: ۱۰۷)	خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار گنہگار ہو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ — خدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

(الانفال: ۵۸)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ○ — خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔

(الحج: ۳۸)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ — خدا اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

(القصص: ۷۶)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ — خدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

(القصص: ۷۷)

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ — خدا فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

(الانعام: ۱۴۱)

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ○ — خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔

(النحل: ۲۳)

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ — خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

(الشوریٰ: ۴۰)

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ ○ — خدا ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

(البقرۃ: ۲۷۶)

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

Marfat.com

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتوں کا پابند اور بُری باتوں سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا۔ اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ — وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کرکے نکھارتا ہے۔

(البقرۃ: ۱۲۹)

اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ

و انما بعثت معلما۔ — اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

(ابن ماجہ: باب فضل العلماء)

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلمِ ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں۔ وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے۔ اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو۔ اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ

Marfat.com

تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع ومحل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کی حد کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے[1]۔ قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئی بعض مسلمانوں نے اُن کی سفارش کرنی چاہی تو آپؐ نے فرمایا "تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب اُن میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے اُن کو سزا دی جاتی اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے[2]۔"

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا۔ صحابہ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُس کو مارنے کو دوڑے۔ آپؐ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو۔ اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں یہ نجاست کے لئے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہیں پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[3]۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہو گئی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا۔ فرمایا "ایک غلام آزاد کرو" عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں"۔ فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو۔ عرض کی "روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا" فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں۔ فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر

[1] صحیح بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [2] صحیح بخاری کتاب الحدود [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔

ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں۔ وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی۔

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا آپؐ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔

قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل اور رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی اور کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور
وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى	رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور
عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ	بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○	سے منع کرتا ہے۔ تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے
(النحل: ۹۰)	تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور اُن سے بچو۔ تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں۔ اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

لہ ابوداؤد باب فی الظہار۔

Marfat.com

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت
صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو۔
مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ[1]
یہ نیکی ایک دانہ ہے۔ زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں
طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے۔ نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی اجر
ہے قرآن نے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ[2]۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان
اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو۔ جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی
بہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی۔ اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ
بھرتے ہیں۔[3] پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی: "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا
گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے"[4] کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا
ہے"۔ اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہو سکتی ہے؟

قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالت
نبوی میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ نے ایک صحابی
کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے ا...

---

[1] البقرہ: ۲۶۱۔ [2] البقرہ: ۲۶۴۔ [3] النساء: ۱۰۔ [4] الحجرات: ۱۲۔

Marfat.com

کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے۔ تھوڑی دور
گئے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی آپ نے پکار کر فلاں صاحب کہاں ہیں۔ انہوں نے کہا ہم یہ ہیں
رسول اللہ! فرمایا تم اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ"۔ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس
کو کون کھائے گا۔ فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی
بات ہے۔[1]

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان
کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے۔ اسلام نے اس طریقہ
کو بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت
بیان کیا "مسلمانو! شراب، جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے
آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے"۔[2] شراب اور جوئے کے برے
نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے
اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بے کار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ جانی و مالی
بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت
اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار
اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ — اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الحدود۔ [2] المائدہ ۹۰-۹۱۔

Marfat.com

تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا۝ (النساء: ۱۴۹)
یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ بے معاف کرنے والا قدرت والا۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے۔ بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کر
تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا
اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔[1]

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "یارسول اللہ! اگر کوئی یہ چا
ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں۔ اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے؟" فرمایا "نہیں"۔

انّ اللہ جمیل یحبّ الجمال۔ اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

(صحیح مسلم و ترمذی)

اس لئے بندوں کو بھی چاہیئے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب: ۲۱)
تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے نمونے سے دی گئی:

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (الممتحنۃ: ۴)
تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے اس کی بڑائی ظاہر کی

---

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث صفحہ ۳۸۵۔

Marfat.com

ہے اور اُن کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بُری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی بُرائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ — بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔ (بنی اسرآءیل: ۲۷)

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی۔ جابر بن سلیمؓ ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہ سُن کر میں نے دو دفعہ کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ آپ پر سلام (علیک السلام)۔ آپؐ چپ رہے پھر فرمایا ”علیک السلام نہ کہو یہ مردہ کا سلام ہے السلام علیک کہو۔ میں نے کہا کہ کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسولؐ ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے، دُعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے“۔ میں نے عرض کی ”یا رسولؐ اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے“۔ ارشاد ہوا ”کسی کو بُرا نہ کہو“۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی بُرا نہیں کہا۔ آپؐ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کئے جاؤ اور تم کو چاہیئے کہ اپنے بھائی سے بات چیت کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے۔ یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے کیوں کہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی

نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا
تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال
کی گردن پر ہو گا۔

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپؐ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑ
گڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے
اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و دنیا کی نصیحت
چاہی۔ ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے یہ نہیں کہ ہر ایک کو ا
ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پوچھ
والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں۔ حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اس
نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں
ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے۔ ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر۔ اس
نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا آپؐ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپؐ
شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے۔ اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہو گا کہ اس سے ا
کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی اس لئے آپؐ نے اس کے لئے یہ علاج تجویز ف
س کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی لیکن آپؐ نے ہر بار
فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

یک دفعہ حضرت ابو ذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کاموں میں بہتر کام کیا

---

[1] عرب امراء فخر و غرور کے لئے ایسا کرتے تھے، جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی۔

[2] سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب۔

Marfat.com

فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے؟ فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو۔ پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کرسکوں؟ فرمایا تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو۔ پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے۔ فرمایا کہ شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کرسکتے ہو۔[5]

کبھی آپ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے۔ وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے۔ آپ ان کی توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو اُن کے دل میں اُتر جاتا۔ ایک دفعہ صحابہ سے آپ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی "ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو نہ سامان ہو۔ فرمایا میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا لیکن اُس نے اس کو گالی دی ہوگی، اُس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال کھایا ہوگا، اُس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا تو اُس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا۔ اگر اُس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اُس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اُس کے نام لکھ دی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[6]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے یہ دریافت کیا کہ "پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟" لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔[7]

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں صبر کی تلقین کرنی تھی تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم

---

[5] ادب المفرد بخاری صفحہ ۵۹ مصر۔ [6] صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم۔ [7] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔

Marfat.com

کس کو کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو۔ فرمایا "وہ بے اولاد نہیں۔ بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی"[1]۔ احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مرجائیں اور اُن کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے، اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں [بٹھا] دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ "میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور بُرا کون ہے؟" حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں) کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور بُرے لوگوں کے نام لیں گے، آپ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا۔ ایک شخص نے کہا "ہاں! یا رسول اللہ فرمائیے"۔ ارشاد ہوا "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی بُرائی سے لوگ امن میں ہوں، اور تم میں سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی بُرائی سے کوئی امن میں نہ ہو"[2]۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں"۔ ابوہریرہؓ نے کہا "میں اے اللہ کے رسول"! ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں "گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے"[3] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)۔

---

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔ [2] ترمذی اواخر کتب الفتن صحیح۔ [3] جامع ترمذی ابواب الزہد۔

Marfat.com

ایک دفعہ فرمایا "کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں[1]۔" کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اُٹھے ہوں گے۔ ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو۔ دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں۔ ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصے کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں: آپ کے غلام ثوبانؓ نے اُٹھ کر کہا میں اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو" چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سُوال نہیں کیا۔

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے۔ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا "لوگو! آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں عرض کی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا "کیا یہ قربانی کا دن نہیں"؟ سب نے کہا جی ہاں! پھر پوچھا "یہ کونسا مہینہ ہے"؟ پھر سب چپ رہے۔ سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے۔ فرمایا "کیا یہ ذی الحجہ نہیں"؟ سب نے کہا "جی ہاں"! پھر فرمایا "یہ کون سا مقام ہے"؟ پھر سب خاموش رہے کہ آپؐ کوئی اور نام بتائیں گے۔ فرمایا "کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے"؟ سب نے کہا جی ہاں! ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن، اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں[3]۔

---

[1] صحیح بخاری باب حفظ اللسان [2] مسند احمد ج ۵ صفحہ ۲۷۰ [3] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ۔

Marfat.com

کبھی خاص خاص صاحبوں کو اُن کی مناسبتِ طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے بڑے ہی زاہد و عابد تھے ان کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا، اے ابوذرؓ: جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو[1]۔

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بُری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی اونڈیل دینا بھی صدقہ ہے[2]"

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپؐ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسولؐ سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسولؐ کی نافرمانی نہ کریں گی[3]۔

---

[1] ترمذی باب ماجا فی معاشرۃ الناس [2] ترمذی فی صنائع المعروف [3] الممتحنہ: ۱۲۔

Marfat.com

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ہم ہر حالت میں رسولؐ
پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے
میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔[1]

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو
آپؐ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل
دل پر بیعت لی "ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ بدکاری نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے اور
سی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے۔ اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی
میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔"[2]
جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے۔ سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے مگر
سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دے دیتے تھے۔ دریافت فرمایا کہ "افترا کس کو کہتے ہیں؟"
خود ہی فرمایا "وہ چغلی ہے۔ لوگوں کے درمیان بات کو اِدھر سے اُدھر پہنچانا"[3] ایک بار ارشاد ہوا کہ "تم
تے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں"؟ لوگوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسولؐ جانتا ہے"۔ فرمایا تم اپنے
ئی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو۔ کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو؟
رمایا "اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے"[4]۔ ایک موقع پر ارشاد ہوا "میں تمہیں
دں کہ جنت والے کون ہیں؟" صحابہ نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہ!" فرمایا "ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر
یں یا جو متواضع ہو لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۵ صفحہ ۳۱۸ [2] صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ کتاب الدیات [3] صحیح مسلم باب تحریم النمیمہ [4] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ۔

اُس کی قسم پوری کر دے" پھر فرمایا "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟" صحابہ نے عرض کی ہا
یا رسول اللہ! فرمایا "ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور"[1]

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اُس کو بار بار دہراتے۔ حاضرین ا
بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ "یا رسول اللہ! یہ کی
بات ہے" اس وقت آپؐ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک د
خود سے فرمایا "خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایما
ہوا" صحابہ نے پوچھا "کون یا رسول اللہ؟" فرمایا "جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا"[2] ایک مرتبہ ا
فرمایا: "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے" صحابہ ک
ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ کس کے ساتھ؟" فرمایا "اللہ کے ساتھ، اُس کی کتاب کے ساتھ، اُس
کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ"[3]

---

[1] صحیح مسلم باب جہنم۔ [2] مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین [3] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کی اُن اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں۔ ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے۔ مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور و طریق۔

ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

Marfat.com

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی

مزید تفصیل کر دی جائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرۃ: ۲۹) — خدا نے تمہارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کا حکم دیا ہے۔ اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے۔ اسی لگاؤ کا نام حق ہے جس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذّٰریٰت۔ ۱۹) — اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ — اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس

لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (المعارج: ۲۴)

کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل: ۲۶)

اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ (الروم: ۳۸)

تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ں ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر۔ ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ (الانعام: ۱۴۱)

اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کرکے ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچانا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

ان لزوجتك عليك حقا و ان لزورك عليك حقا ولاهلك

تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اور

Marfat.com

علیک حقا[1] — تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنا اور اس کے چہرے پر تھپیٹر نہ مارے[2]۔ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے حقوق ہیں بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے۔ اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فان لنفسك عليك حقا[3] — بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

فان لجسدك عليك حقا — تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں

ولعينيك عليك حقا[4] — کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عا[م طور] پر سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے۔ جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ ص[رف کیا] جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے [جا] تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر [طرح] میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے۔ اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ [ہر] عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم [سے شروع ہو کر] پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: باب العوم [2] ابوداؤد: کتاب النکاح [3]، [4] صحیح بخاری: باب الصوم۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری
جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے۔
انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں۔ایک یہ کہ جس غرض
منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے۔دوسرا یہ کہ ان کی قدرتی نشو و نما،
رش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کی مناسب
سیرابی اور آرام کی فکر رکھے۔یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے
(البقرة:۲۹) (یعنی انسانوں کے) لئے پیدا کیا۔

صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ اُن سے
کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئیں۔اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں
ان پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے فرمایا
ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جارہا تھا کہ دفعتہً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لئے
نہیں کیا گیا۔میں تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں[1]۔اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا
کہ جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب
درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]۔اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]۔
ایک اور تمثیلی حکایت میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲ [2] صحیح بخاری و مسلم باب مذکور [3] فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح
باب مذکور، جلد خامس صفحہ ، مصر

Marfat.com

کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔ اور ایک اور شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ
اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی۔ ایک اور شخص
نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات
دائرہ کتنا وسیع ہے۔ وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جس
تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی۔
جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو تورات
کی طرح مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا۔ لیکن صرف محبت کرنا کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اس
کی تفصیل کرنی چاہیئے جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں۔ یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا
کارنامہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو
لئے رکھتے ہو۔" اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم
اور مال و ملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لئے چاہنا اور پسند کرنا تورات
کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرِ عنوان ہے۔ لیکن اسلام میں یہ سرِ عنوان تشریح کا محتاج ہے
تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر
رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج و ترتیب کے ساتھ
متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک

لہ یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں۔ لہ صحیحین کتاب الایمان۔

ری) ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بے گانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی
ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے۔ مگر یہ ترتیبی امداد حق
ساتھ ہے۔ اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بے گانہ کی امداد جو حق
ہے، فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے اس کا نام اسلام کی
طلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے۔ انسان اور حیوان
درمیان بھی خطِ فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے، اور
انسانوں میں اہلِ ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی
اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر کا
ر رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے۔
دیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے
ر حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ
ں دیا گیا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی
ری گہری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب
ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے۔ ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی
ہر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس
مداد کرنی چاہیئے۔ یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ

سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ۔

تعلقات کے دوسرے تیسرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اُن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے ۔ یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے ۔ یہ ایثار نہیں ظلم ہے ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا ۔ شریعتِ محمدیؐ نے اسی فطری ترتیب کو ان آ میں پیش کیا ہے :

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ط

(النساء: ۳۶)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ ۔

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

(البقرۃ: ۲۱۵)

اے پیغمبر! ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو و اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیمو اور غریبوں اور مسافر کے لئے ۔ اور جو نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝

(بنی اسرآءیل: ۲۶)

اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا ۔ اور فضول نہ کر ۔

Marfat.com

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ
ت یہی درجہ رکھتی ہے۔ مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات
دوسرے ابواب میں ہے۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور محمد
صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے بلکہ تینوں میں اُن کا درجہ خدا کے بعد
انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خُدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی
تاکید کی گئی ہے۔ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا
تجھے دیتا ہے دراز ہو۔" (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا اس نے اپنے
باپ یا ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔" (احبار ۲۰-۹)

"اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے۔" (خروج ۲۱-۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی

Marfat.com

،نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے ۔فرمایا:

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے ۔پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں ۔پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔ (متی ۱۵ ؍ ۳ ۔ ۴)

نبوتِ محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے ،اس نے تورات و انجیل ؒ نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشے کی کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

ں نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی کچی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ مب سے بڑا درجہ ماں کا ہے ۔عورت کی فطری کمزوری ، بے چارگی اور حمل. وضعِ حمل اور اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا ، ماں کی بڑائی ، اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے :

وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ
َمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّ
ِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ
(لقمان: ۱۴)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ اِحْسَانًا

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے

ؒ علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے ۔ بشنو متی ۱۵ . ۱۹ امرقس ۷ ، ۱۰ و ۱۰ ۔ ۱۹ الوقا ۱۸ ، ۲۰ ۔

Marfat.com

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ (الاحقاف: ۱۵)

ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔ پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی۔ ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟" فرمایا "تیری ماں"۔ پوچھا "پھر کون؟" فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے عرض کی "پھر کون؟" فرمایا "تیری ماں"۔ تین دفعہ آپ نے جواب دیا۔ چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا "تیرا باپ"[۱]۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے[۲]۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے۔ کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟" فرمایا "کیا تیری ماں زندہ ہے؟" جواب دیا "نہیں"۔ "کیا خالہ ہے؟" گذارش کی "ہے"۔ فرمایا "تو اس کے ساتھ نیکی کر"۔[۳] یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں"۔ فرمایا "کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟" جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا "تو اسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاس ہے"۔[۴]

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی

---

[۱]، [۲] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب۔ [۳] جامع ترمذی کتاب البر والصلہ۔ [۴] ترغیب و ترہیب جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ، نسائی و حاکم۔

Marfat.com

ب ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے انسان سب
زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں وہ خالق اکبر کی علتِ
ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ
مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی شکل سہ
سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا پھر اس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت
پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور
پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خواہش نثار کر دی ایسی حالت میں کیا
سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لئے شریعتِ محمدیؐ نے اپنی
یں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی سزاوار ہے۔
ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے۔ اور شک
اکہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں۔ اس
ب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی
شوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ
نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی عزت کرنے اور ان سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا
ان کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی بلکہ یہاں
تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤں
پنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے
ا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں
نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی

Marfat.com

کی علت فاعلی اور دوسری علت مادّی ہے۔ سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تو
کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ قف وَبِالْوَالِدَیْنِ
اِحْسَانًا (البقرۃ: ۸۳)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو۔ اور ماں باپ
کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیتِ پاک گو اُس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے لیکن یہاں توراۃ کی طرح م
باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ "نیکی کرنے" کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم
میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا۔

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ
وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ
وَابْنِ السَّبِیْلِ ط (البقرۃ: ۲۱۵)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو وہ ماں باپ
رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجو
اور مسافروں کے لئے۔

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ
تاکید کی جاتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ
شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا
(النساء: ۳۶)

اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ ک
شریک نہ بناؤ۔ اور ماں باپ کے
بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلال و حرام کی ہزاروں رسم
خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں

Marfat.com

بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج

(الانعام ۱۵۲)

کہہ (اے پیغمبر) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو۔ فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○

(بنی اسرائیل ۲۳-۲۴)

اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

Marfat.com

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اُٹھانا روا نہیں بجز اس کے کہ اگر وہ اس کو شرک کی دعوت دیں تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

(العنکبوت: ۸)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو اُن کا کہنا نہ مان۔ تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بُت پرستی کی دعوت دیں تو صرف اُن کی اس دعوت کو قبول نہ کرو لیکن اُن کی دنیاوی خدمت، اور حُسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے۔ فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے۔ میرے ہی پاس پھر آنا ہے۔ اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو

Marfat.com

فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ز (لقمان: ۱۴-۱۵)	شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دُنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گذران کر۔

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے مگر دوسری دنیاوی باتوں ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہو گی کہ وہ ایمان لا کر حسن خاتمہ پر مرے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ (ابرٰھیم: ۴۱)	اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دُعا کی:

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ (نوح: ۲۸)	اے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لئے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دُعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حُسن سلوک کرتے ہیں، اُن کی خدمت بجالاتے ہیں اور اُن کے لئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کُرْهًا وَّ	اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس

Marfat.com

وَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ
ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۚ حَتّٰٓى إِذَا بَلَغَ
أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ
قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى
وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ
وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ إِنِّيْ تُبْتُ
إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا
عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ
فِيْٓ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۚ وَعْدَ الصِّدْقِ
الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝

کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ
میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنی اور پیٹ
میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے ہیں،
یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا
اور چالیس برس کا ہولیا اس نے کہا کہ میرے
پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس
احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور
میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ
کام کروں جس کو تو پسند کرے۔ اور میری
اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا
اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں یہی
وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول اور ان
کے برے کاموں سے درگذر کرتے ہیں۔
یہ جنت والوں میں ہوں گے۔ یہ سچائی کا
وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

(الاحقاف: ۱۵-۱۶)

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت و رضا مندی کو وہ پانی ب
ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ
نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے کبھی فرمایا ہے کہ "ماں کے

، نیچے جنت ہے"۔ کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ!
رے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے"؟ فرمایا "تیری ماں"۔ دریافت کیا پھر کون؟
یا "تیری ماں"۔ عرض کی "پھر کون" فرمایا "تیری ماں"۔ گذارش کی "پھر کون"؟ چوتھی بار فرمایا "تیرا باپ اور اس
بعد جو اسکے قریب ہے پھر جو اسکے قریب ہے"۔ ایک دفعہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس اقدس میں
ریف فرما تھے۔ جاں نثار حاضر تھے (3) فرمایا وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا۔ صحابہ نے پوچھا کون
سول اللہ؟ ارشاد ہوا "وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت
پایا اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی"۔ ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت
یا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے؟ فرمایا "وقت پر نماز پڑھنا"۔ عرض کی
پھر کون سا؟ ارشاد ہوا "ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا"۔ دریافت کیا "پھر کون سا؟" فرمایا "خدا کی راہ
میں محنت اٹھانا (جہاد)"۔

ایک دفعہ آپؐ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان
فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ تینوں نے
بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔ قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اس غار کا
منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بے چارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ان
کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں
دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا
چاہیئے۔ ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے

لہ مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلہ۔

Marfat.com

بچے تھے۔ میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا۔ جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا نہ اُن کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت اُن کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں۔ میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا۔ اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے۔ یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی۔ اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے۔ اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اس جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں جس کو ان کی خدمت گذاری کے لئے وقف ہونا چاہیے تھا اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت اقدس میں آکر شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں؟ عرض کی جی ہاں" ارشاد ہوا پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔"

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت

Marfat.com

ذکر ہے احادیث میں بھی اس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہ سے فرمایا "کہ تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی
م کی ہے"۔ ایک دفعہ صحابہ سے جو خدمت میں حاضر تھے دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں
ب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ! "فرمایا خدا کے ساتھ شرک کرنا۔
ں باپ کی نافرمانی کرنا"۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے
جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی[1]"۔

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے وحی محمدیؐ
نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے۔
مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے ما اسلام نے اس
گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار
ے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے۔ لیکن اگر اس نے اس
ہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے۔ اسلام کے قانون
یں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں
وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہو گا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہو گا۔ کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری
محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو بالقصد کی بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا آنکہ
اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو[2]۔

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیت کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، مشکوٰۃ باب مذکور۔ [2] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلاقصد سمجھا گیا ہے اس لئے اکثر فقہا نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

Marfat.com

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کر دیا ہے۔ لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰ نے بھی جو گو د انجیل کے بیان کے مطابق، ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا۔[1] مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو اور اس لئے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے۔ اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایک ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا اور مٹ کر بدل سکتا ہے۔ لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے راضی تھے مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں۔ اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کریں

---

[1] مرقس ۱۰-۷،۸۔

اولاد کا حق

اصولی تعلیم جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اور اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذہب لے کر تشریف لائے اُس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کا نہایت جامع متن ہے۔ ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے یہ متن اُن سب پر محیط ہے۔ فرمایا:

لیس منّا من لم یرحم صغیرنا	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے
ولم یوقّر کبیرنا	اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ
(ترمذی)	ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت

یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں ، بڑوں، افسروں، ماتحتو
آقاؤں، نوکروں ، بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پا
جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو
ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام ک
سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام
کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں ۔ اگر واقعاً کسی جماعت
یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا وا
ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں بلکہ اس کی حیات کی تکمیل
اس کی نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہے یہی س
ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (استقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعۂ حمل کے ضا
کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم
جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگ د
کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا۔ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خو
اور مرضی سے انجام دیتے تھے اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے ۔ ایک تو مذہبی
یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کر کے ان پر چ
دیتے تھے ۔ منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچہ[1] کی قربانی کریں گے ۔ یہ قابلِ نفرت

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب لا یجوز من ال

رف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی رومتہ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون
ں "اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت
ے رواج تھا۔" ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے
ور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ
ہ بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی
جاتی تھیں۔ قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل
کیا گیا ہے ؎:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝

(الانعام: ۱۳۷)

(جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوب صورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تاکہ یہ دیوتا ان کو ہمیشہ کے لئے، ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔

لہ لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول صفحہ ۲۳ ؎ کشاف زمخشری تفسیل آیت مذکورہ۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَھُمْ سَفَھًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۴۰)
گھاٹے میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا اس لئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ نبوت محمدیؐ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے آتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہ ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ھود: ۶)
اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔

اس لئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ ط اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا ○ (بنی اسرآءیل: ۳۱)
اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو۔ ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔ ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ
کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر

Marfat.com

عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (الانعام: ۱۵۱)

سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے۔ خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو۔ ہم تم کو اور اُن کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔)

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا "یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟" فرمایا شرک۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا "والدین کی نافرمانی" پھر عرض کی اس کے بعد۔ فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔[1] یہ جواب حقیقت میں آیتِ بالا کی تفسیر ہے۔ انہی تعلیمات دربوت کے اس پرتوِ فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق خدا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے۔ ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے۔ اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو گئی۔

(اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا۔ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں۔ قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ

اور جب اُن میں کسی کو اس کے ہونے کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید، و تفسیر سورۂ بقرہ، و سورۂ فرقان، و کتاب الادب و کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

Marfat.com

لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○	خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔)
(الزخرف: ۱۷)	

(رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے۔ قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خوش خبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے۔ (یعنی زندہ دفن کر دے۔)
(النحل: ۵۸-۵۹)	

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا۔ بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۸۷ مطبعۂ خیریہ مصر، زیر مثل اضل من موؤد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے[1]۔

یہ رسم جس شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرت ناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[2] ہے کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔" رحمتِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس پُر درد افسانہ کو سُن کر آنسو ضبط نہ کر سکے۔ ایک صحابی نے اُن صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضورؐ کو غمگین کر دیا۔ فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے"۔ پھر اُن صاحب سے فرمایا "ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سے سناؤ"۔ انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی۔ پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے۔ اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو"۔

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی کہ "یا رسول اللہ! میں

---

[1] ابن جریر و ابن کثیر و درِ منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر۔ [2] سنن دارمی صفحہ اول۔ یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں لیکن اس لئے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے۔

Marfat.com

نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں" فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو" عرض کی "یارسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں" فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو"۔

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھیں۔ ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی الموؤد من ظلم اُمّہ
کما لقیت ذھل جمیعا وعامر

(زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی۔ فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو"۔

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور اُن کی پرورش کی چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو عرض کی "یارسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے تین سو ساٹھ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا؟" فرمایا "ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان

لہ تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزاز و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزاز و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۃ اذا الشمس کورت۔ ےہ موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ۔

Marfat.com

ہے۔[1] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبویؐ سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے وہ بھی اس قسم
لیوں کو اپنی آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور اُن کی پرورش کرتے تھے جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں
ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں چاہے اُن کو میرے ہی پاس رہنے دو۔[2] یہ شخصی
نیں تھیں جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں
دم پر ہمیشہ کے لئے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے۔ نبوت محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو
رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئیں۔ فرمایا جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی
بت میں مبتلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس
بالے گی۔ وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔[3] نیز فرمایا "جو دو لڑکیوں
ں پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اُس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اُٹھا
رمایا کہ یوں برابر ہو گا"۔ غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی عہد محمدیؐ میں اگر عزت
سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتوں اور مردوں سے
ت لی۔ صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں اُن سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں
دفعہ یہ بھی ہو وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ "کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی"۔ چنانچہ
حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی۔ فتح مکہ

---

[1] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی تفسیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰ [3] صحیح بخاری
کتاب الادب و صحیح الادب و صحیح مسلم کتاب البر [4] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق [5] الممتحنہ ۱۲ -

کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے تو آپؐ نے عورتوں ...
طور سے اس کا اقرار لیا اور انہوں نے اقرار کیا۔[1] عید کے اجتماعِ عام میں عورتوں کے مجمع میں آپؐ تش...
لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی۔[2] دوسر...
پر بھی جو خواتین دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا۔[3] بعض روایتوں ...
ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک ...
تھی۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا ان میں ایک
تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔"[4]

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے۔ آ...
فرمایا کہ "ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکا...
گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے۔ جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور ...
نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو...
اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب د...[5]
سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔"[6]

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء۔ [2] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۳۲ باب موعظۃ... یوم العید۔ [3] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمیٰ بنت قیس۔ [4] تفسیر ابن... صفحہ ۳۴۴ برحاشیہ فتح البیان بحوالۂ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ علیٰ شرطِ مسلم۔ [5] صحیح بخاری کتاب الا... باب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸۔ [6] صحیح بخا... وکتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، تمام سنگ دلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ شہنشاہِ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں:

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸-۹)	یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔

اس درجہ بلیغ اور مؤثر طرزِ ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہؓ زہرا کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے۔ حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے۔ حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے[1]۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء۔

Marfat.com

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یا یہ ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعۃً چار چار گودیں خالی ہو جاتی ہیں اور فیصلہ مشکل۔ وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان:۷۴)

(جنت ان کو بھی ملے گی جو......) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذ قام النبی الجواریا

پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت و حضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو و نما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے۔ رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے۔ اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض کر دیا

اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے :

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ؕ

(البقرۃ : ۲۳۳)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ یہ مدت اس کے لئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔ اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا ارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا۔ اور اس کا درجہ ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا ا ہے۔ فرمایا:

وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ

(النساء : ۲۳)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ ی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی ئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے۔ اور باپ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثا پر ہے۔

تعلیم و تربیت ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا در

قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے اس حق کو

جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ فر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ — اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور

وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم: ۶) — اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگِ خاندان کا فرض ہے۔ یہ آگ جہنم کی آگ

مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت ہے جو بالآ

انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت

تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کر

ہیں اور کہتے ہیں کہ بارِ الٰہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حُسن، صورت و سیرت کی خوبی، اور د

کی بھلائی دے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔ فرمایا:

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا — اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو

مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ — کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم

أَعْيُنٍ — کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد

(الفرقان: ۷۴) — کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فر

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ سا

کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیئے۔ ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ

نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور اُن کی خدمت کی

Marfat.com

بت چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دُعا
تے ہیں:

وَاَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ ۚؕ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡكَ وَاِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ○ (الاحقاف:۱۵)

اور (اے خداوندا!) میرے لئے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنائیں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دُعا بھی
ے اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پاکر مختلف
یقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی میں آیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ کو پیار
ر رہے تھے۔اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی۔اس نے کہا کیا آپؐ بچوں
و پیار کرتے ہیں؟ میرے دس بچے ہیں میں نے اُن میں سے کسی کو پیار نہیں کیا"حضور صلی اللہ
لیہ وسلم نے اس کی طرف نظر اٹھائی پھر فرمایا"جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"[1] دوسری
وایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا"اگر اللہ تعالےٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا
ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں"[2] ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش

[1] و [2] یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد میں ہیں، نیز دیکھو ابو داؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔

Marfat.com

آنا چاہیئے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں۔ اس وقت کاشانۂ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا ام المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔ ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِ رمق سے محروم رکھے۔ اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دیا حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا۔ حضورؐ نے سُن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ اُن کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لئے آڑ بن جائیں گی۔" نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔" اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچّہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچّہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے۔ ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت میں داخل فرمائے گا۔[۳]

---

[۱] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات [۲] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الولد

[۳] سنن ابو داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

ن میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعتِ محمدیؐ میں قائم نہیں۔ اسی لئے دُنیا کی
شریعتوں اور قانونوں کے برخلاف اسلام میں بڑے اور چھوٹے کے امتیازی حقوق نہیں کہ
یک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے
ی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے
ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو۔ انہوں
خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی۔ دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو
ایک غلام دیا ہے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا "تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔"
اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج
ور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے یا اس کو کوئی ترجیحی حق ہو۔ اصلاح کر دی
اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا
سل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

لہ ابو داؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔

Marfat.com

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلّقات کی فہرست میں تیسرا درجہ ز
کا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین
کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچّوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا اسی طرح حقوق
کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرّت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب
کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقّیِ مدارج کے
و مانع تسلیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام
نظریہ کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرّد اور عورت سے بے تعلّقی ہی کمالِ روحانی کا ذ
اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرّد میں ہو
اس سے بدرجہا زیادہ تعلّقِ ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حُسنِ معاملہ اور حُسنِ سلوک

ل انجیل قرنتیون ۷۔۸۔

شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو، اور
کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق
ل کے لئے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی
جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی وہ پوری
تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و
کا سبب قرار دیا۔ حکم ہوا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (النور: ۳۲)	اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ، اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو۔ اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیتِ پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب و تنگ دست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی
ان کو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے۔ مذہبی حیثیت
تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں عزت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو۔
کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا۔ اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے ایک تو یہ کہ
کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ

Marfat.com

اور کام کرنے والے ہوں گے۔اس فلسفہ کا راز اہلِ دولت نہیں غریب ہی سمجھ سکتے ہیں خصوصاً اور کاشت کار۔دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ ہلانے پر تیار ہوتا ہے۔اس لئے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہو گا کہ کہیں سے پیدا کرے۔خصوصاً اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر کر دے گی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہو سکتا۔آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے،اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے،غیب کا علم اسی کو ہے اس اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف حرہ کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے۔فرمایا:

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُم ۚ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۚ (النساء:۲۵)

اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو۔اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کر لو اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان میں کچھ نہیں ہوتا خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے

یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی۔ تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے۔ ہر
دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس
اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقہ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو
رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی
ہے۔ چنانچہ زن و شو کے باہمی اخلاص و محبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں
ایک قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الروم: ۲۱)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ۔ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

Marfat.com

قرآنِ پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے و
ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے۔ اس کا خلوت خانہ عالم کی
دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے۔ اس لئے میاں
کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیئے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض
کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثارِ قدرت میں شمار کیا ہے پو
ہوں۔ یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر و محبت اور سکون اور چین۔ اگر کسی نکاح سے قدرت کے
اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت
ہے کہ ان لوگوں کی سخت بُرائی کی ہے جو زن و شو کے باہمی میل جول اور
محبت میں فرق ڈالیں۔ فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ..... مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرۃ: ۱۰۲)	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں ..... اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے او
بیوی شوہر کی فرماں برداری اور شوہر بیوی کی دل جوئی کرے۔ زن و شو باہم اپنے حقوق کے
لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھ
خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تع

شکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے
زدہ دی ہیں۔ فرمایا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ (النساء: ۳۴)	مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لئے کہ مرد اپنا مال ان پہ خرچ کرتے ہیں۔ تو نیک بی بیاں فرماں بردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی
ہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے۔ اللہ تعالےٰ
ہیں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے اُن کو محفوظ کر دیا ہے۔
ر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالےٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو
معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم
زم، ایک دوسرے کے پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ
۔ قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ
ادا کر دیا ہے:

Marfat.com

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (البقرۃ: ۱۸۷)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیساکہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں۔ تم ان کے ستر ہو وہ تمہارے لئے، تم ان کی زینت ہو وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو وہ تمہاری۔ یہی نکاح کے اغراض ہیں اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی ... کی ہے۔ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ○ (النسآء: ۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔ اس خدا کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں ایت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے۔ اور اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں ے اس خالقِ حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا ئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا۔ اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود میں آیا ہے۔ اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دُنیا ے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودّت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو۔ قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ[1] "پاک دامنی کے لئے، نہ کہ شہوت رانی کے ئے"۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا "اے جوانوں کے روہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ ہیں گی۔ اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے[2]"۔

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔ اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہیئے۔ اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاحِ حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے فرمایا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا[3] "اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں"۔ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا[4] "اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو"۔ کہیں اسی

---

[1] المائدہ: ۵ [2] ابن ماجہ، باب النکاح [3] البقرہ: ۲۲۸ [4] النساء: ۱۲۹۔

Marfat.com

اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (البقرۃ: ۲۳۰) یہ کہ میاں بی بی دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے وحی کی زبانِ مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (البقرۃ: ۲۲۴)

اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیٰحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسنِ سلوک (برّ) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ)، اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآنِ پاک نے یہ بتائے ہیں:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (النساء: ۳۴)

تو نیک بیویاں شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزّت و آبرو، کی حفاظت کرتی ہیں۔

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرماں بردار رہیں۔ اُن کے مال و دولت ملکیت کی جن کی حفاظت اُن کے سپرد ہے۔ پوری نگرانی رکھیں۔ اور ان کی عزت و آبرو کی جو اُن کی عزت و آبرو ہے شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں۔ مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ ص اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مایا کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب ں کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم ری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے[1]۔

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع[2] کے مشہور طبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں۔ تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو۔ تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو۔ بے شک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں۔ اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو[2]۔

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟

---

[1] و [2] ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

Marfat.com

فرمایا جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے اس کو بُرا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علیحدہ کرے۔ دوسری طرف آپؐ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں۔ یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" آپؐ نے طریقۂ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لئے اختیار فرمایا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلہٖ — تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے۔
(ترمذی و دارمی و ابن ماجۃ)

خِیارکم خِیارکم لنسآءھم — تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہیں۔
(ترمذی)

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے۔ جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ حال سُنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

ولزوجك عليك حقًا (بخاری۔ کتاب النکاح) — اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ وہ ہر وقت معمولی

لہ ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

Marfat.com

ورتوں پر ماری پیٹی جاسکتی تھیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا
اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ "ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار
میں نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے۔"

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش
کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا۔ البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو
تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی۔ ارشاد ہوا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرۃ: ۲۲۸)	اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتوں کی
نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے
گئے ہیں۔ یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور
کرنے کے سلسلے میں ہے۔ گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے
قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے
گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں۔ قرآنِ پاک نے اس کی
مصلحتیں بھی بتادی ہیں۔ فرمایا:

لہ صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورۂ تحریم۔

Marfat.com

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النسآء:۳۴)

مرد عورتوں کے نگران ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے۔ اور اس لئے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے علمی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں اس لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیئے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوش گواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو۔ بعض مرد چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں۔ آپ نے اُن کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے ان کے اسی ٹیڑھاپن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو گے تو تم اس کو توڑ ڈالو گے[1] آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ

---

[1] صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح۔

Marfat.com

یا۔فرمایا "اپنی بیوی میں کوئی بُرائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دُوسری
ی بات بھی نکل آئے گی یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے :

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النسآء : ۱۹)	اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو۔ اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی خانگی مشغولیتوں ی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے۔ اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، ور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے۔ اپنے لئے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے۔ اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو۔ اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے[1]۔ انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچّہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدرِ ضرورت لے لیا کرے۔ فتح مکّہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ

---

[1] صحیح مسلم کتاب النکاح باب الدیۃ بالسنایۃ، اس اختیار کی تشریح میں مذاہب مختلف ہیں۔ تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۳۲۶ مصر

اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں؟ فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔[1]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے۔ فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہو گی۔۔۔۔ مرد اپنی بیوی بچوں کا نگراں ہے اس سے اس کی پوچھ ہو گی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اس سے اس کی پوچھ ہو گی[2] نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی	تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان
الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ	سے علیحدگی برتو اور ان کو مارو تو اگر وہ
اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ	تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت
سَبِيْلًا (النساء: ۳۴)	تلاش کرو۔

لغت میں "نشوز" کے معنی "اُٹھ جانے" کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

---

[1] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحہ ۸۰۸۔ [2] بخاری جلد اول صفحہ ۷۷۹، باب قوا انفسکم واھلیکم۔

ومعنى ذلك اذا رأيتم منهن ماتخافون ان ينشزن عليكم من نظر الى ما لا ينبغى لهن ان ينظرن اليه ويدخلن ويخرجن واستربتم بامرهن۔ (تفسیر طبری ج ۵۔ ص ۳۸)

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہیئے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔

عن محمد بن كعب القرظى اذا راى الرجل تقصيرها فى حقه فى مدخلها ومخرجها قال يقول لها بلسانه قد رأيتك منك كذا وكذا فانتهى

(تفسیر طبری ج ۵۔ ۳۸۔ مصر)

محمد بن کعب قرظی سے ہے جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی یہ دیکھی تو اب باز آجا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزة هى الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه

(عالمگیری۔ نفقات)

نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔ کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے[2]۔

---

[1] اصل متن تفسیر میں واستبرتم غالباً غلط چھپا ہے [2] تفسیر ابن کثیر۔

Marfat.com

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے
کے معنی آپ کھل جاتے ہیں۔ آیتِ مذکور پوری یہ ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء: ۳۴)	مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے، اس لئے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں۔ تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزّت وآبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے۔ اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو مارو۔ تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔

اس آیتِ پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے۔[1]
نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار ا
عزّت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں "نشوز" کا ڈر
تو اس کو پہلے سمجھاؤ نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کر و یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو۔ اس

---

[1] اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

Marfat.com

ی نہ مانے تو اس کو ذرا مار وساب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے بلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے۔ پھر یہ ی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار ں و دولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز ا ڈر ہو تو یہ یہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت وآبرو کی حفاظت، جو عورت ن دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

"شوہر کی عزت وآبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث یں موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا "سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور ن کے مال کی حفاظت کرے۔" "اپنی جان کی حفاظت" سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے ہیں اُن میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے۔ صحیح مسلم میں ہے:

واتقوا اللہ فی النساء فانھن	عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو کہ
عندکم عوان ولکم علیھن	وہ تمہارے بس میں ہیں۔ تمہارا ان پر
ان لا یوطئن فرشکم احدا	یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی
تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن	سے نہ رندوائیں جس کو تم ناپسند

ضرباً غیر مبرح — کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابنِ ماجہ میں یہ الفاظ ہیں :

استوصوا بالنساء خیرا فانھن عندکم عوان لیس تملکون منھن شیئاً غیر ذٰلك الا ان یاتین بفاحشة مبینة فان فعلن فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضرباً غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا

(کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو۔ وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں تو اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کردو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔ تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو اُن پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔

"شوہر کے بستر کو روندلنے" کا کنایہ اس طرف ہے کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو۔ اور "کھلی بے حیائی" سے جدھر اشارہ ہے چھپا نہیں۔ لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشۃ مبینہ کی تفسیر میں داخل کیا ہے[1]۔

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شر

[1] یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لئے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے۔ تفسیر سورۃ النساء : ۱۹۔

میں تصریح ہے کہ یہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے۔ بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے[1] جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے۔ ایاس بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ "خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو نہ مارا کرو" تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں" تو آپؐ نے مارنے کی رخصت عطا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہلِ بیتِ نبویؐ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکائتیں لے کر آئیں۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکائتیں لے کر آئی تھیں، یہ یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے، تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں"[2]

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپؐ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا"[3] یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ "یا رسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے"۔ فرمایا "طلاق دے دو" عرض کی "اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے" فرمایا "تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو"[4] ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو"[5]

---

[1] تفسیر طبری جلد ۵ ص۴۳ [2] ابوداؤد ابن ماجہ و دارمی [3] صحیح مسلم باب المطلقہ ثلثاً [4] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد [5] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

Marfat.com

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شو کے بعد درجہ بدرجہ دُوسرے اہلِ قرابت کا ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلۂ رحم" ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ سبب ہے کہ وحیِ محمدیؐ میں اِس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآنِ پاک میں کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض حق بتایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم:۳۸) تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل:۲۶) اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خو کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیے خود تکلیف اُٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی اور حاجت روائی اصل نیکی ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى (البقرۃ:۱۷۷) اور (اصل نیکی اس کی ہے جس نے) مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

Marfat.com

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں ۔ فرمایا :

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (البقرۃ : ۲۱۵) — کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے ۔

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دُوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے اُن خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا :

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی (البقرۃ : ۸۳) — (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا ۔

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل : ۹۰) — بے شک اللہ انصاف اور حُسنِ سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے ۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں فرمایا :

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ (البقرۃ : ۲۱۵) — کہہ دے اے پیغمبر کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے ۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اسکی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں ۔ ارشاد ہوا :

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ — اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشایش

Marfat.com

وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى	والے ہوں وہ قرابت مندوں اور
وَالْمَسٰكِيْنَ (النور: ۲۲)	محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری
اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے۔ فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ	اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز
شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ	کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ
بِذِي الْقُرْبٰى (النساء: ۳۶)	اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی اُن تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں اُن کو پیش آئیں اپنے اُس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل اور مزدوری اپنی اُمت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور اُن سے لطف و محبت سے پیش آؤ۔ فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا	کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر
الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى	بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا
(الشوریٰ: ۲۳)	کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔ اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک

Marfat.com

عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی
مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط
کھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائگی واجب ہے۔
لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن
شکم مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو
اس اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت
سے باہر ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

اُن لوگوں کو جو محبت کی فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحیِ محمدیؐ نے فاسق
کا خطاب دیا ہے اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے؛

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ (البقرة: ۲۶-۲۷)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں، اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی اِسی فطری گرہ کی تشریح
استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے
اس لیے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کرکے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا اس کو
میں نے ملایا۔ جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا"[1]۔ اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے
رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرشِ الٰہی کو پکڑ کر کہتا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البر والصلۃ۔

ہے، ''جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے''[1]۔ ایک اور
پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا۔ ارشا
کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحمِ انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن
میں حقوہ ہے) تھام لیا۔ خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے
بچے گا۔ کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو
کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[2]۔ یعنی رحمِ مادر اور اس رحمان کے رحم (دو کرم ا کے د
حرفوں کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے۔ اور اس
اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشار
سورۂ نساء میں فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ	اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک
وَالْاَرْحَامَ ط	دوسرے سے درخواست کرتے ہو
(النسآء: ۱)	اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ!
مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی
اس کا ساجھی نہ بناؤ۔ نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا
کرو[3]۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلہ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلہ۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو صلہ رحمی یعنی
بت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1]" (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس
ت تک رُکا رہے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک
و چکے گا)۔

ابوہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جس کو یہ پسند
کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے[2]"۔
حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس
ے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں۔
ب یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دُوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر
ں سے کچھ حصّہ اُن کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی
عت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صُورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے۔ انسان کے تنگی افکار اور
اندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال، تکدّر اور دلی پریشانی کا سبب
وتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلہ رحم اور خوش خلقی
سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے۔
جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں
حدیث ان لفظوں میں ہے: "صلہ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت
ور عمر میں برکت ہوتی ہے"۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم القاطع۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم۔

Marfat.com

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے[1] جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی۔

Marfat.com

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وُہ دو آدمی ہیں جو ایک دُوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔
...انیت اور اس کے تمدّن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔اس
...یا میں ہر انسان دُوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے۔اگر ایک بھوکا ہے تو دُوسرے
...ق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اُس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست
...اس کی تیمار داری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اُس کا شریک اور
...مدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور
...قوق کی ذمّہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور
...دی حیثیت سے جتنا ایک دُوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی اور
...وحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دُوسرے سے ملا ہوا اور ایک
...کا وجود دُوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں
...انسانوں پر جو ایک دُوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمّہ داری
...رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دُوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو انہیں سے تکلیف اور دُکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ

Marfat.com

ہوتا ہے جو ایک دُوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دُوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سدِّ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دُوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اِسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں۔ عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے بلکہ وہ عزّت و افتخار کا موجب تھے۔ اگر کسی عرب کے پڑوسی پر ظلم ہو جائے تو وہ دُوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔

وحیِ محمدیؐ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے۔ ان سب قسموں کے ہمسایوں میں یہ حق اُس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا یا کوئی اور دُوسرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے:

وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ (النساء: ۳۶)	اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کیساتھ (نیکی کا حکم دیا)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار اور عزیز اور "بیگانہ"[1] کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں۔ سرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں، اور "دور" سے مطلب سرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[1]۔ لیکن حقیقت میں اختلاف بے معنی ہے۔ تعلیمِ محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں اُن کو جیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا ئی دُوسرا تعلق بھی موجود ہو۔ وُہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو یا ہم مذہبی ہو یا کسی قسم کی رفاقت ہو۔ بہرحال حق کے ساتھ دُوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکمِ الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دلنشیں انداز سے فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔" جاں نثاروں نے پوچھا "کون رسُول اللہؐ!" فرمایا "وُہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں[2]۔" ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[3]۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[4]۔"

ایک اور موقع پر اس کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب۔

اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے[1]۔" ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے اُن فرمایا کہ "جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں اُن کو کا حق نہ دلا دیں[2]۔" حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا "یارسُول اللہ میرے دو ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں۔" فرمایا "جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھ قریب ہو[3]۔"

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں بلکہ کھانے معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیح کہ "اے ابوذرؓ! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایو کرتے رہو[4]۔"

اِن تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے۔ اس لیے نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے مسلمانوں کی بیو میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں ہو

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی حق الجار۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق قرب الابواب۔ [4] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی حق الجوار۔ [5] صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحقرن جارۃ لجارتہا۔

Marfat.com

ت دونوں بیویوں کے لیے ہے یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ
پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دُوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اُس کی حقارت کرے۔
ایک مُسلمان کی مروّت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے
کے رنج وتکلیف کی پروا نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " مومن وہ نہیں
سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔"*

بُرائی بُرائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو۔ لیکن اگر وہ اس
جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور بُرائی کا درجہ
ہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا
ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان میں چوری کرنا کتنا بُرا ہے۔ بدکاری ہر جگہ اُس سے ممکن
پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس
یف مردوں پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہیں اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے۔
یے توراۃ میں یہ حکم تھا:

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔"

(خروج ۲۰-۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔" (احبار ۱۹-۱۳)۔

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل اُن الفاظ میں

---

* شکوٰۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری

Marfat.com

فرمائی جن میں تورات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برُا کر کے دکھایا۔ ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"زنا حرام ہے۔ خدا و رسُول نے اُس کو حرام کیا ہے لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ خدا و رسُول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے"[1]

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں۔ زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ لوگوں نے اُن کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا "اس میں کوئی نیکی نہیں اُس کو دوزخ کی سزا ملے گی"۔ پھر صحابہ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں، معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں۔ فرمایا "یہ بیوی جنتی ہوگی"[2]

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔ (مرقس ۱۲-۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے پیار کرنے پر قناعت فرمائی۔ بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا۔ ارشاد ہے:

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے"[3]

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار [2] ادب المفرد امام بخاری باب لا یؤذی جارہ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو
رار دیا۔ فرمایا :

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے یا جس کو خدا اور
اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا
حق ادا کرے ۔"

اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ
ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے۔ انسان کی خوش خلقی اور بد خلقی کا سب سے بڑا معیار
کہ اُس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ چنانچہ ایک دن صحابہ
چھا کہ "یارسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا بُرا"۔ فرمایا "جب اپنے
کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سُنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب بُرا کہتے سُنو
ہو کہ بُرا کر رہے ہو"۔

کوئی پڑوسی اگر بُرائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو مگر اس کی
کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ بُرائی نہ کرو۔ یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا۔
ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ "یارسول اللہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے"۔
"جاؤ صبر کرو"۔ اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے ۔ پھر یہی نصیحت کی۔ وہ پھر
اور یہی عرض کی۔ فرمایا "جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو" (یعنی گھر سے منتقل
نے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے؟
انے حقیقت حال بتائی۔ سب نے اُن کے پڑوسی کو بُرا بھلا کہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایسا

رزاز بیہقی ۔ احمد بن حنبل۔ مسند عقبہ بن عامر ۔ سنن ابن ماجہ۔

شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے[1]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں

کیا ہے؟ عرض کی "امیر المومنین گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت

ہے۔" فرمایا "اے جابرؓ! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا

ہو؟ کیا یہ آیت یاد نہ رہی[2]:

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں
النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ	گے (اُن سے کہا جائے گا) تم اپنے
حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا	مزے اپنی دُنیا کی زندگی میں لے
(الاحقاف: ۲۰)	چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا

وہ دنیا کی کروہ لذت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اُٹھ گئی تھی۔ حضرت

بنؓ عمر نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ اُن کے پڑوس میں ایک یہودی بھی

انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ ہمسایہ کے ساتھ

کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے

---

[1] ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار، وابو داؤد کتاب الادب، باب حق الجوار۔ [2] موطا امام مالک باب ما جاء
کتاب الادب باب حق الجوار۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے جماعت کے ہر رکن کا فرض
ے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے
ا کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے،
ں و شعور کے پہنچنے کے بعد اُس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور
لڑکیوں کی حفاظت اور اُن کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے۔ یہ وہ احکام ہیں
لہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا[1]

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی مگر
ا کہ چاہیے اُن کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی وراثت سے
وم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے اور نہ سنگدل عربوں
ں عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا۔ قرآن پاک میں اُن کی اس بدسلوکی
ذکر بار بار ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ — کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۃ النساء، ج ۴ ص ۱۵۰۔

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ○ (الماعون: ۱-۲)

کو جھٹلاتا ہے۔ سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ○ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ○ (الفجر: ۱۷-۲۰)

نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو۔ اور مرے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے "کہ شہر کے پھاٹک کے جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں"[1]۔

انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی داد رسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی اصلی داد رسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کی شریعت لے کر دنیا میں آیا۔ وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ .....

کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا،

---

[1] استثناء ۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (الضحیٰ: ۶و۹)

اس نے پناہ دی ...... تو یتیم پر ستم نہ کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے یتیموں کے اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بیکس گروہ پر رحم کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں دولتمندوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار اصل کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کرسکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنیں چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ (البلد: ۱۴-۱۵)

یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا (الدھر: ۸)

اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا بھی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی۔ سورۂ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے۔ ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور جو جاہلیت میں طرح طرح کی بد دیانتی کرتے تھے ان سے کہا گیا:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ

حُوْبًا كَبِيْرًا ۝	کر دو۔ اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر اُن کا مال کھا جاؤ۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔
(النسآء : ۲)	

دولت مند یتیم لڑکیوں کو اُن کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے میں لے آتے تھے اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے۔ اس پر حکم آیا:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (اُن کو چھوڑ دو اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔
(النسآء : ۳)	

یتیم بچوں کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ اور تک اُن کو پورا شعور آئے وہ اُن کے سپرد کیا جائے۔ بلکہ اُن کے سن رشد کو پہنچنے اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کی جائے۔ فرمایا:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (النسآء : ۵-۶)	اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نہ پکڑا دو اور اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول بات کہو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو جب وہ نکاح کی طبعی عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال اُن کے حوالہ کر دو۔

Marfat.com

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع میں
ہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے وہاں
ل کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ "تم اپنا مال اُن کو نہ دو" اور آیت کے آخر میں
ن بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے وہاں
ل مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے کہ "تم اُن کا مال اُن کو واپس کر دو" اس
ے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی
ی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت
ئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت
ے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔

متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے
، یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی:

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ	اور اُڑا کر اور جلدی کر کے اُن کا
يَكْبَرُوا ۚ (النسآء:٦)	مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحبِ جائیداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو اُن کے لیے اُن یتیموں
کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا۔
اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ	اور جو (متولی) بے نیاز ہے اس کو
وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ	چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو
بِالْمَعْرُوفِ ۚ (النسآء:٦)	منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ (النساء: ۱۰۷)

اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی اُن میں ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (الانعام: ۱۵۲)

اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورۂ اسرا (بنی اسرائیل) کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائیداد یتیموں کی جائیداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہیے اور دیانت داری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔[1]

یہ تو صاحبِ جائیداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے۔ جو یتیم غریب و مفلس ہوں اُن کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء اور حشر میں بار بار اُن کی پرورش اور اُن کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث اُمّت کے سرپرست صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اُن نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کی

[1] بنی اسرائیل: ۳۴۔

ں خود اپنے برابر جگہ دی۔ فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں
ں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔"[2] یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر لاکر
ے اور اُس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا بشرطیکہ
ں نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشایش کے لائق نہ ہو۔"[3] نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ
مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے اور سب
ے بد تر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بد سلوکی کی جاتی ہو۔"[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل
بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے۔
صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی
ر ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کیلئے اپنی آغوشِ محبت
پیش کرنے لگا۔[5] بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہؓ بتول اپنے دعویٰ کو
نالیتی ہیں۔[6] حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان[7] اور انصار[8] وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے
رلے جاکر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کبھی
یم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔[9]

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو اُن کا حصہ دینے اور اُن کے مال و دولت
کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت

---

[1] صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیماً و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم [2] ترغیب ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۳ و ص ۱۳۴ بحوالہ ترمذی
یث حسن صحیح) [3] ترغیب ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۳ و ص ۱۳۴ بحوالہ ابن ماجہ ادب المفرد باب من یعول یتیماً [4] صحیح بخاری باب مرۃ القصار [5] ابوداؤد باب
نائم فی الخمس [6] موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ و زکوٰۃ اموال الیتامیٰ و زکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق [7] مسند احمد جلد ۶ ص ۲۶۹ [8] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق
بن الاجدع تابعی، و مسند جلد ۶ ص ۲۳ [9] بخاری ادب المفرد باب فضل من یعول یتیماً۔

Marfat.com

میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعوای پیش کیا مگر وہ دعوای ثابت ہو سکا اور آپؐ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا۔ آپؐ کو رحم آ اور اُس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔ وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا۔ ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے انہوں نے اُس شخص سے کہ کہ تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔ اس نے آمادگی ظاہر کی انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔[1]

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں مگر اگر یہ سوال کیا جائے کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی[2] عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا۔ اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و چین کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں[3] اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی۔ اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ اُن کی جائیدادوں کی نگرانی، اُن

---

[1] استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ ابوالدحداحؓ [2] تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں [3] حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے اُن میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

Marfat.com

املات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں۔ اور یہی وہ دستور ہے جس کی
روی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میئر یا آرفنس کورٹ کے
ام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

Marfat.com

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہیں۔ نہ اُن کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔ عورت جس کو خدا نے دنیا کی عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے۔ اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعات کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا۔ عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبر

Marfat.com

انون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیے اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کرسکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دینِ مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اِسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور صرف اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہوسکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں۔ اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا یعنی "شمار کے دِن"۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اُس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی۔ اس کا دینِ مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اوّل ضروری ٹھہرایا پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا۔ عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

Marfat.com

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مرد کی عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا جائے۔ قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ — اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔ (النور: ۳۲)

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اُس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ اُن کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کیے جن میں سے آٹھ حضرت سوؓدہ، حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، اُم سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپؐ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔ یہ تو آپؐ کا عمل تھا۔ قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس فرقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا بآسانی حاصل کر

Marfat.com

ہے۔ فرمایا:

السّاعی علی الارملۃ والمسکین	بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ
کالسّاعی فی سبیل اللہ واحسبہ	کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ
قال کالقائم لا یفتر وکالصّائم	میں دوڑنے والا (اور راوی کہتا ہے
لا یفطر۔[1]	کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا
	کہ) اور جیسا وُہ نمازی جو نماز سے نہیں
	تھکتا اور وُہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

السّاعی علی الارملۃ والمسکین	بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ
کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالّذی	کرنے والا خُدا کی راہ کے مجاہد کی
یصوم النھار ویقوم اللّیل۔	طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو
(صحیح بخاری کتاب الادب)	دِن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

اِن بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وُہ تکلیف اُٹھاتی ہوں لیکن اِن ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دُوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں جب تک وُہ بڑے ہو کر علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دُنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا "میں: اور محنت ومشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔ وُہ حسن وجمال اور جاہ وعزّت والی بیوی جو

---

[1] صحیح بخاری وصحیح مسلم ومؤطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے یہاں تک کہ وُہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں[1]۔" اسی مقصد کو ابو داؤد کی مسند میں ہے کہ آپ نے اس طرح ایک واقعہ کی صُورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنّت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تُو کون ہے؟ تو وہ کہے گی، کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے[2] تھے۔"

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً[2] حاشیہ سنن ابی داؤد بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن ابن نور الدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اُس کو دُوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسرں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی جماعت کے ہر رُکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے۔ اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذراسے فرق سے ایک آیت ہے:

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (الذّٰریٰت : ۱۹) — جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (المعارج: ۲۴-۲۵) — جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی

Marfat.com

مالی مدد کا خواستگار ہو۔ محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض اس کو محروم کہ
ہیں جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصّہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت
محروم ہو، کوئی متعفّف کے معنی لیتا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت
ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا مح
ہو گیا ہو۔ اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآن پاک[1] سے ہوتی

دُوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ۔ مفسّرین دونوں آ
میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق "حق
بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق "حق" کا نہیں
"مقررہ حق" کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو۔ کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں
زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت
اور افتاد پڑی ہو دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دُوسرے موقع پر ہے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ: ۱۰) اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔

یہاں "سوال کرنے والے" کے معنی اغنیٰ[2] کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے
کے سمجھے جاتے ہیں مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی
کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی[3] ہو، یہاں تک کہ کوئی لنگڑ

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورۂ قلم میں اصحاب
کے قصہ میں محرومون اور سورۂ واقعہ میں بل محرومون کے معنی۔ [2] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے واما
من ذی حاجۃ فلا تنھر زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالبِ علم لیا ہے۔

Marfat.com

صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے۔ اس کے سوال کو بھی سختی سے رَد نہ کرو بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عُذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○ (النساء: ۸۵)	جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہو گا اور جو بُری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا۔ اور اللہ ہے ہر چیز کا نگہبان۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقت ور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے۔ تاہم الفاظِ قرآنی کی وُسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں اصُول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا۔ ایسا ہی بُرے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہوتا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ	اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دُوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور

Marfat.com

الْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (المآئدۃ: ۲)

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دُوسرے کے مددگار نہ بنو۔ اور ڈرو اللہ سے۔ بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اُس کو دینا، مُسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مُسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیامۃ۔ (متفق علیہ)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ اور جو کسی مُسلمان کی کسی مصیبت کو دُور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دُور فرمائے گا۔

ایک دُوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

واللہ فی عون عبدہ ما کان العبد فی عون اخیہ (ترمذی)

اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سائل حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب

ملے گا[1]۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو[2]۔
بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے[3]۔ یہ بھی ارشاد
ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی
قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے[4]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ
[2] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ [3] ترمذی کتاب البر [4] ترمذی کتاب البر و الصلۃ۔

Marfat.com

بیمار[1] کے حقوق

دُنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمار داری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں "عیادت" ہے۔

---

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمار داری، غمخواری اور خدمت گزاری بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کی جائے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمار داری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو جاہلیت کے زمانہ میں تھا کہتا ہے:

زھب الرقاد فما یحس رقاد ۔۔۔ مما شجاک و نامت العواد

تجھے جو صدمہ پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیمار دار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیماری طاری ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گزاری اور تیمار داری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مراحل شامل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہیں، تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمار داری کا ثواب کتنا ہوگا۔

ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے
...ہیں جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف
...زیادتی کا خیال ہے اُن کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے کلی
...ل بنا دیا ہے:

وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (النور: ٦١)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔
لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (الفتح: ١٧)	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ (التوبہ: ٩١)	نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ[1] (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) اسی طرح ان
...، تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ[2] (خدا کو معلوم تھا کہ
...میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی۔
...مَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا[3] (تو تم میں جو بیمار ہو) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی،
...ڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر
...از کی رخصت دی گئی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے اُن سے اپنے فرائض
...عاف کر دیئے تو بندوں کو کس حد تک اُن سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔
اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت

---

[1] ...نساء: ٦۔ [2] المزمل: ٢٠ [3] البقرہ: ١٩٦۔

Marfat.com

میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لیے وہ اُس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہے اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس کے آداب تعلیم کیے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے۔ فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا خدا اُس[2] کے غم کو ہلکا کرے گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دُوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرے[3]۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے[4]۔ ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں[5]۔ یہ بھی آیا ہے کہ "جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[6]"۔ فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسہ دے اور اس کو شفا پانے کے لیے خدا سے دعا کرے[7]۔

---

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد، اوائل کتاب الجنائز۔ [2] ابو داؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم۔ [3] ... کتاب الجنائز۔ [4] صحیح بخاری و کتاب الجنائز۔ [5] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز۔ [6] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفہ۔ [7] ... ابی داؤد کتاب الجنائز۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم سے صحابۂ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان میں بھی تفریق نہ تھی۔ آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے[۱]۔ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں[۲] اور اسی سے علمانے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[۳]۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ نے اُن کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا کہ بار بار اُن کی عیادت کی جاسکے[۴]۔ رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں[۵]۔ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں[۶]۔

آپؐ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ، اور بیمار کی عیادت کرو[۷]۔"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ "اے آدم کے بیٹے میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی۔" وہ کہے گا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہاں کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیوں کر کرتا۔" فرمائے گا "کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [۳] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ۔ [۴] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔
[۵] سیرت ابن ہشام، غزوۂ بنی قریظہ و ادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و اصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھیے۔ [۶] صحیح مسلم، غزوۃ النساء۔ [۷] مسند احمد صفحہ ۳۹۴/۴۔

Marfat.com

میرا بندہ بیمار ہوا مگر تُو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]
تعلیم کی یہ طرزِ ادا، بیمار پُرسی، بیماروں کی تیمار داری اور غم خواری کی کیسی دلنشین تعلیم ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا۔ اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

Marfat.com

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے۔ ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے۔ قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے یعنی خود بادشاہ بن کر عیش وراحت، سیر و تفریح، اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے۔ ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربوں میں بھی اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا کیونکہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔

اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاہدۂ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے

Marfat.com

بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستوں
حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قر
کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ زید بن حارثہؓ، خباب بن الارتؓ، بلالؓ
یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابو فکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہؓ اور سالمؓ غلاموں میں اور لبینہؓ، ز
نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کی آغوش میں آئیں۔ اور ز
حارثہ کے سوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے سب نے اسلا
محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں ہم

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا
جز بنا لیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا۔ سورۂ بلد میں
میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے ان میں ایک فَكُّ رَقَبَةٍ
"گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا" بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت
حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو
سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا۔ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ یعنی گردن کو آ
بہت سی فرو گذاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہ
ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ صحابہ نے اپنے پیغمبرؐ کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز
غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ حضرت حکیم بن حزامؓ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے
ہیں اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے[1]۔ حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

Marfat.com

م آزاد کیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار
وں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اُس کے بندوں کے ساتھ نیکی
جائے۔ ان بندوں میں سرِ فہرست جن لوگوں کے نام ہیں اُن میں یہ مظلوم فرقہ بھی
۔ فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا

(النساء: ۳۶)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ، اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ، اور پہلو کے رفیق کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں۔ اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے۔ لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت
ی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ
ی میرا جوان کہے۔ اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ " وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ

صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب باب الہجرۃ ؎ یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔

کہیں بلکہ مولیٰ کہیں[1]۔ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ "یہ جن
تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے۔
جس کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور
پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو
کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے[2]۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ اُن کے غلاموں
آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی[3]۔ ان بے خانماں افراد کو اُن کے آقاؤں کے گ
کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے
اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہو گا[4]۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے
افسروں کو حکم دیا تھا کہ رُومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں اُن کو اُن
قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو اُن کا حق ہو وہ اِن کا ہو اور اگر یہ غلام
تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں[5]۔ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ
سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس
آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ما ینہی عن السباب۔ [3] صحیح بخاری جلد
الآداب باب ما ینہی عن السباب۔ [4] حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق (ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے
حدیث میں او انتمیٰ الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ (جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسو
پر خدا کی لعنت) امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ھو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا
کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق) [5] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدّن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے
ہے مگر گذشتہ نظامِ تمدّن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی۔ اور اب بھی مہمان نوازی شرقی
ں کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدّن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے ہر
کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں
حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت
و کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی
م کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہلِ عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔
ی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض
یت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان
ں میں آیا ہے:

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ إِذْ دَخَلُوْا

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ

عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ
قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ۝ فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ
فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ ۝ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ
قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ فَأَوْجَسَ
مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ
وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝

(الذّٰریٰت: ۲۵۔۲۸)

جب (یہ لوگ) اُن کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا۔ (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا (ایک موٹا) تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے۔ اور ان کے سامنے رکھا (تو انہوں نے تامل کیا۔ ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے۔ انہوں نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں، اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔

اس حکایت سے آدابِ مہمانداری کے متعلق حسبِ ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ ازراہِ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے اُن سے الگ ہو گئے۔

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

(۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے اُن کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے۔ یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور اُن کے اہل و عیال کے کام آئے۔ اسی لیے جب اُن لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور اُن کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔ اسی لیے

Marfat.com

ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کیوں
ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت د
کے لیے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصّہ بیان کیا گیا
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کا خیال رکھنے کے ساتھ میزبان مہمان کی عزت و آبرو
بھی محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہ
میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی
ہوتی ہے۔ اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتا
چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ (الحجر: ۶۸-۶۹)

کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو۔ اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی ارشادات تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکا
میں مہمان نوازی کو یہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک
دیا اور فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے ک
پڑوسی کی عزت کرے۔ اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس
کہ اپنے مہمان کا جائزہ، عزت کے ساتھ دے" کہا گیا کہ "یا رسول اللہ اس کا جائز
فرمایا کہ "ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے اس کے آگے مہمان پر

؎ بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الاٰخر فلا یوذ جارہ۔

ایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی
کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے
ت کے تعلقات کو جوڑے رکھے"۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمرؓو کے پاس
یف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ نہیں خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو، اور دن کو
، رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا بیشک۔ فرمایا ایسا نہ کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ
رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا
ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔[2]

ایک حدیث میں ہے کہ" ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے پھر اگر مہمان کسی
ہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہے وہ لے چاہے چھوڑ دے"۔[3]

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی
ال بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لیے ضرورت تھی
ہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو
یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے
چہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں
نا چاہیے کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔[4] اس کے
وہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمته ایاہ بنفسہ وقوله تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین [2] بخاری کتاب الادب
حق الضیف [3] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔ [4] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمته ایاہ بنفسہ۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے۔ تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسانوں کو آگاہ اور باخبر کرے۔ اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا — اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

(البقرۃ: ۸۳)

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں۔ دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف بھی منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی — اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر
اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ — آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف

Marfat.com

لِلتَّقْوٰی — نہ کرو۔ عدل اور انصاف (ہر حال

(المائدۃ: ۸) — میں) کرو کہ یہ بات تقوٰی کے قریب ہے۔

ہر قسم کا بُرا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دُوسرے انسان اور ایک قوم
ری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دُوسرے کے حق میں
سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ یہ آیتِ پاک
ن کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔ ابوہریرہؓ اور انس ابن مالکؓ سے
بت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا (بخاری)

آپس میں ایک دُوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دُوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دُوسرے سے منہ پھیرو۔ اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں،

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولاتحسسوا ولاتجسسوا ولاتناجشوا ولاتحاسدوا ولا تباغضوا ولاتدابروا وکونوا عباداللہ اخوانًا (صحیح بخاری: کتاب الادب)

بدگمانی سے بچو کہ بدگمانی بہت جھوٹی بات ہے۔ لوگوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ آپس میں حسد نہ کرو۔ آپس میں بغض نہ رکھو۔ اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ ... جس پر سچائی سے عمل

کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے۔ فرمایا من لا یرحم لا یُرحم[1] "جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا" جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا یا یہ کہ جو دُوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا"[2] یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا"[3] اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا۔ صحابہ نے پوچھا "اے خدا کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے؟" فرمایا: "ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے" یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے[4]۔ اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا "جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو۔ بُرائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آؤ"[5]۔

---

[1] صحیح بخاری۔ [2] مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج ۴ ص ۱۵۹ [3،4] دیکھو یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب کے مختلف ابواب میں ہیں۔ [5] جامع ترمذی باب ما جاء فی معاشرۃ الناس صفحہ ۲۳۱۔

بھریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ احب للناس ماتحب لنفسک یعنی تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بن۔ کیوں کہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے۔ ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔" بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی۔ تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔" اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے۔ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرامؓ نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک

لہ ترمذی ابواب الزہد غریب۔

Marfat.com

مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اُس کو کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ "اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں۔ قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہلِ کتاب میں ہیں اُن سے جزیہ نہ لیا جائے۔[۱]

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دُوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا۔ ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن[۲] نے "اسیر" کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے۔ ابو میسرہ اور عمرو بن میمونؒ اور عمرو بن شرجیلؓ صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔[۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا[۴] اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔[۵]

تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری[۶]:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ — اُن کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات

۱؎ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲، بمصر۔ ۲؎ سورۂ دہر، ۸۔ ۳؎ کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳ و ۶۱۴ مصر

۴؎ بخاری کتاب الجمعہ۔ ۵؎ مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین ۶؎ طبری۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ — (البقرة: ۲۷۲)	نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔ اور جو بھلائی سے خرچ کرو، وہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یحبّ للنّاس ما یحبّ لنفسه وحتّٰی یحبّ المرء لایحبّه الّا للّٰہِ عزّ وجلّ (مسند احمد ج ۳ ص ۲۷۲)	تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کردی گئی ہے۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔ اور اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اُس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا، اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی اُن کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دُشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی بن گئے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ

اے مُسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور نہ تم مرو لیکن مُسلمان۔ اور خُدا کی رسّی کو مضبوطی سے

اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡکُرُوۡا
نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً
فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ
بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ

(آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو،
اور تم اپنے اُوپر اللہ کے احسان کو
یاد کرو کہ تم دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے
دِلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہوگئے۔

مُسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبّت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا
ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر
لتا تھا:

وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ
مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ
بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ
بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ۝

(الانفال: ۶۳)

اور خدا نے مُسلمانوں کے دل ملا دیئے۔
اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ
کر دیتا تب بھی تو ان کے دلوں کو
ملا نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا۔ بےشک
وُہ (ہر شکل پر) غالب آنے والا اور
مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مُسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب مل کر خدا کے
ین کی رسّی کو جو اُن کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبوط پکڑیں۔ اور باہم اختلاف پیدا کر کے
کڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیونکہ اس رسّی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل
کر اس کو پکڑے رہیں فرمایا:

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا

اور اللہ اور رسُول کا کہا مانو اور

Marfat.com

فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ — آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (الانفال:۴٦)

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ۔ اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو۔ اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ — تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (النساء:۵۹)

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں۔ اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ — اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو۔ تو اگر وہ رجوع کرلے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح

اللہ یحب المقسطین ۝ انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم

(الحجرات: ۹-۱۰)

کرادو اور انصاف کرو۔ خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا۔ انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انصر اخاک ظالما او مظلوما

(بخاری)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیوں کر کی جائے۔ فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا وہ دفعۃً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا۔ خدا نے فرمایا:

فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین

(التوبۃ: ۱۱)

تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا۔ اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی

Marfat.com

ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (الاحزاب: ۵)

تو اگر تم اُن کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔

ایک مُسلمان کسی مُسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (البقرۃ: ۱۷۸)

تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مُسلمان پر دُوسرے مُسلمان کی غیبت حرام ہے کیوں کہ

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (الحجرات: ۱۲)

کیا تم میں کوئی پسند کریگا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جز بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہیں جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرۃ: ۲۲۰)

اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو (تو یہ بھی جائز ہے) کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

ایک مُسلمان بھائی کا دُوسرے مُسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دُوسرے

ہیں دعائے خیر کریں۔ وہ یوں کہتے ہیں :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (الحشر : ۱۰)	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔

ایک مُسلمان کے دِل میں دوسرے مُسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی بُرائی ہے جس کے دُور کرنے کے لیے خُدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے :

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (الحشر : ۱۰)	اور ہمارے دِلوں میں مُسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مُسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ خدا نے مدح فرمائی :

رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح : ۲۹)	وہ (مُسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں۔

مُسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مُسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے :

اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (المائدہ : ۵۴)	مُسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مُسلمانوں کی اس باہمی اخوت و محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے "مُسلمانوں کو باہم ایک

Marfat.com

دُوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں[1]۔ صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا "سارے مُسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دُکھ محسوس کرتا ہے، اور اگر سر میں دَرد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے[2]۔" مقصود یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ایک جسم ہے اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دُکھ دَرد میں شریک ہوتے ہیں یہی مُسلمانوں کا حال ہونا چاہیے، کہ اُن میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مُسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مُسلمان باہم ایک دُوسرے سے مِل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصّہ سے اس کا دوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہے[3]۔" بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصّہ سے دُوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہے۔

اس تمثیل میں آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مِل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے۔ جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مُسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اُس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مِلی ہوئی ہے۔ جب یہ اینٹ اپنی

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۲ کتاب الادب و صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۸۹ کتاب البر والصلۃ والآداب، مصر [2] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۸۹ مصر، کتاب البر والصلۃ والآداب [3] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹ و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۲۸۹ مصر

بلہ سے کھسک جاتے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اس کی تحقیر کرے۔ انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔"[2]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا۔ اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالےٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالےٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"[3]

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۲ مصر [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۰ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۱۹۴۔

فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں[1]" یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے"۔ فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں[2]" یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی۔ نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا[3]" کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے اُس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے[4]" یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے۔ اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ فرمایا "مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے"

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ	کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے۔
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ	وہ اس میں پڑا رہے گا اور خدا اس پر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۔ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۴۹
[3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۳ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲ و ج ۲ صفحہ ۸۹۳۔

Marfat.com

لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ○ خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔ (النساء: ۹۳)

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا۔ پھر فرمایا "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"[1] ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھاتے وہ ہم میں سے نہیں۔"[2]

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے۔ فرمایا "سب سے بڑا ربا (سود) کسی کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔"[3] اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے۔ ارشاد ہوا "جو کسی مسلمان کو کبھی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔"[4]

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ اُدھر منہ پھیر لے اور یہ اِدھر منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو کہ پہلے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ صفحہ ۱۰۴۰۔ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۸۹۔ [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۸۹۔

Marfat.com

سلام کی ابتدا کرے۔[1]" ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دُوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو۔ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔ اور کسی مُسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وُہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔[2]"

ایک مُسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہے قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تُو مُسلمان نہیں:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ (النساء: ۹۴)	اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو کہ تُو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مُسلمان کہے یا وہ مُسلمان ہونے کا دعویٰ کرے کسی مُسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں۔ ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی اُن صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ نے اُن کو بُلا کر دریافت کیا۔ انہوں نے عرض کی "یا رسُول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔" آپ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا "تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے؟" ایک روایت میں ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا۔[3]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۶۔ [3] پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے، دُوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور۔

Marfat.com

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ" مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے
ر ہے[1]" یہ بھی فرمایا کہ" جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے تو وہ کفر دو میں سے ایک
ٹے گا[2]"۔ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مُسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک
ڑا کفر ہے۔

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ" جو کوئی قسم کھا کر کسی
لمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا۔ ایک
ص نے عرض کی" یا رسولؐ اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی"؟ فرمایا" درخت کی ایک
خ ہی کیوں نہ ہو[3]"

فرمایا" ہر مُسلمان پر اُس کے مُسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کا جواب دینا ہں
چھینکنے پر" خدا تم پر رحمت کرے" کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت
نا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا[4]" یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو
لمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حُسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ" جب کوئی
لمان اپنے بیمار مُسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت
ا روش پر ہوتا ہے[5]"۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ" جو کوئی ایمان و
خلاص کے ساتھ کسی مُسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب صفحہ ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب
ایمان ج ۱ صفحہ ۴۲ مصر۔ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۵ مصر۔ [4] سنن ابی داؤد کتاب
ادب ج ۲ صفحہ ۲۰۱۔ [5] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۸۴ کتاب البر والصلۃ۔

Marfat.com

ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتی اُحد کے پہاڑ برابر ہو گی[1]۔" یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہو گی بلکہ یہ اُس پیمانہ سے ہو گی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کی جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اُس برادرانہ الفت و محبت کی فروع ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہو گا جب تک وُہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے[2]۔" الغرض ملتِ اسلامیہ کی جماعت کا ہر رُکن دُوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے۔ ابو داؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مُسلمان مُسلمان کا آئینہ ہے اور مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے۔ اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے[3]۔"

دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی۔ اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جاتے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں جیسی آج ہیں۔ ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آیندہ بھی بنے گی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲۔ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۔
[3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲، تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

Marfat.com

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات
ب وسیع ہے۔ اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت
ا۔ اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔
، جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھا
ؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری
ے اپنا اپنا ایک اُونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا۔ جو رُک جاتا وہ ہار جاتا۔ یہ سب جانور
دست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان
اقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو
اس کی سواری کے جانور کو اُس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں
یتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا۔ ایسے جانور کو بلیۃ کہتے تھے۔ اسلام
آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز
ے باندھ کر اُس پر نشانہ لگاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جانوروں
کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی رُوح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا

Marfat.com

جائے[1]۔ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اُس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کر دو کیوں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے[2]۔ اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اُونٹ کے کوہان اور دُنبہ کے دُم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مُردار ہے[3]۔ یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[4]۔

بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[5]۔ ایک حدیث میں ہے کہ "کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پُرس کرے گا" صحابہ نے پوچھا یا رسُول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کر

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ صفحہ ۲۵۵ [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء ما قطع من الحی فہو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد دوم صفحہ ۱۸۲۔

پھینک دے[1]"۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں اُن کا مارنا جائز نہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص کنجشک کو بے ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کرے گی کہ "فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے۔ اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[2]۔" جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا اُن سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اُن کا مارنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ آپؐ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہُدہُد اور صُرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]۔

جو جانور ضرورةً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں اُن کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو۔ تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[4]۔"

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ "یارسولؐ اللہ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے" یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں فرمایا کہ "اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کرے گا[5]۔" یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[6] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۵۰۔ [2] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۲۹۔ [3] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۲۔ [4] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔ [5] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۳۶۔ [6] نسائی ص ۶۲۳۔

Marfat.com

فرمایا کہ "اس سے نہ شکار ہوسکتا ہے نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[1]"۔ مطلب یہ کہ بلاضرورت جانوروں اور پرندوں کو صدمہ پہنچانا جائز نہیں۔ جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا۔ اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[2]۔ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لیے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو اگر خدا اُن کو معاف کردے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کردیئے[3]۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپؐ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ بنایا ہے جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے دریافت کیا کہ "یہ کس نے کیا ہے؟" اُن صاحب نے کہا "یا رسولؐ اللہ! یہ میں نے کیا ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "بجھاؤ[4]" (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں)

---

[1] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ۔ [2] بخاری کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۵۔ [3] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔ [4] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا[1]، یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ کر لائے۔ چڑیا فرطِ محبت سے اُن کے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لیے سزاوار ہے[2]۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے۔ اسی عدمِ واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں اُن پر بھولے بھٹکے اُونٹ بھی آجاتے ہیں۔ اگر میں اُن کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[3]۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ

---

[1] بخاری جلد اوّل کتاب بدء الخلق صفحہ ۴۶۷۔ [2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار۔
[3] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء۔

گئی۔ اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا۔ کنو
سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس
اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور
کو پلایا۔ خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اس کو بخش دیا۔ صحابہ کرام
اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ "یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثو
ملتا ہے"؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[1]۔ صرف جانو
ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور ف
کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جا
کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ[2] یعنی ثواب کا کام ہے۔

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے م
اصول بتائے، یعنی:

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ چنانچ
کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس
لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں[3]۔ نیز ف
اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ۔ خدا نے ان کو تمہارا فرمانبردار صرف
بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے
پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں پ

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔ [2] بخاری ابواب الحرث وا
باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ۔ [3] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ۔

Marfat.com

پوری کرو[1]۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوا ہونا چاہیے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ[2] تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پاتے۔ ایک بار آپؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ فرمایا "ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ[3]۔"

ایک بار آپؐ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے۔ اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا۔ آپؐ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا "یہ کس کا اونٹ ہے؟" ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ!" فرمایا "اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ۔ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب والنہی عن التعریس فی الطریق۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔

Marfat.com

بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔[1]

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔[2]

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔[3]

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یؤمر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔

[2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

Marfat.com

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کی جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ قدیم حکمائے
اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک اُمہاتِ اخلاق اور دُوسری فروعِ اخلاق۔ اُمہاتِ
اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دُوسرے اخلاق کی اصل و مرجع
ہیں اور جن میں کمی وبیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے
فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوتِ علمیہ، قوتِ شہوانیہ،
اور قوتِ غضبیہ۔ قوتِ علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کا نام
عفت اور قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے۔ اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل
کہتے ہیں۔ پھر ان دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے
مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں۔ لیکن اسلام کے پیشِ نظر
ان کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے۔ کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق
کا عالم بنانا نہیں بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً

Marfat.com

بچانا ہے۔ اس لیے اُس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس
دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح
اخلاق کا پابند بنایا اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے۔ اسی لیے اپنی تعلیم میں اُس نے
کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات
مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے
بُرا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس
عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی بُرا
اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں
وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند
رذائل کہلاتے ہیں۔ ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ
جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام
یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جابجا اُن کی تصر
لیکن اُن کے بیان میں اخلاقِ شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی
اسی لیے اُن کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے
خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی
اور مسلمانوں کو اُس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوئی میں زیادہ

ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اور غور و فکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے۔ لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے یا اُن اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں جا بجا اُن کی تفصیل ہے جیسے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے۔ جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بیکار باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ اُن پر کوئی الزام نہیں۔ تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی اصل

يُحَافِظُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ هُمُ	وارث ہیں جو فردوس کے وارث
الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ	ہوں گے اور وُہ اس میں ہمیشہ
الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝	رہیں گے۔

(المؤمنون: ۱-۱۱)

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں: نکمی اور بے کار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد۔ ایک دُوسری جگہ ہے

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	اور لیکن اصل نیکی اُس کی ہے جو اللہ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ	پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور
وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے
وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو
الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى	اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے
الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي	دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی
الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ	اور اپنے قول کو جب انہوں نے
الْبَاْسِ ۭ	اقرار کر لیا پورا کرنے والے اور
	مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی
	کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے

(البقرۃ: ۱۷۷)

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں: سخاوت، قول و قرار پورا

Marfat.com

ا اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ (آل عمران: ۱۷)

ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے۔ اسی سورہ میں ان متقیوں
ل ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۴)

جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام پر) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے۔ سورۂ معارج
ہے:

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝

اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے۔ اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

Marfat.com

إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝
إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ
هُمُ الْعٰدُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ
لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُونَ ۝
(المعارج: ۲۸-۳۳)

بے شبہ اُن کے رب کا عذاب نڈر
ہونے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور
شرعی باندیوں سے کہ اس میں اُن
پر کوئی ملامت نہیں۔ جو اس کے علاوہ
چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے
ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے
عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی
گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔ سورۂ احزاب میں اُن مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ
الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ
الْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَ
الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ
وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَ
الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے
والیاں اور صبر کرنے والے اور صبر
کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے
اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ
دینے والے اور صدقہ دینے والیاں
اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے

Marfat.com

اَلْحٰفِظٰتِ (الاحزاب: ۳۵) — والیاں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ (الفرقان: ۶۳)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں اور جاہل جب اُن سے (جہالت کی باتیں کریں) تو وہ کہیں سلامتی رہیئے۔

(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان: ۶۷)

(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (الفرقان: ۶۸)

(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ (الفرقان: ۷۲)

(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جاتیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور

سلامتی یا سلام کہیں۔

میانہ روی، تیسری میں عدمِ ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے۔ سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی:

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں۔ اور جس کے جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو اُن کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں انہی کے لیے پچھلا گھر ہے۔

(الرعد: ۲۰-۲۲)

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے۔ ... سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے۔ اور جس کے ... کا حکم ملا ہے وہ اہلِ قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں۔ ان دو کے سوا ان آیتوں ... کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں یا یہ کہ بھلائی کر کے ... کو دھو دیتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	اس پچھلے گھر کو ہم اُن کے لیے کریں

Marfat.com

لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (القصص : ۸۳)

گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ اور آخر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ (الشوریٰ : ۳۷)

اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (المائدۃ : ۴۲)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (البقرۃ : ۱۹۵)

بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

Marfat.com

صِدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرِ فہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا سچائی ہے۔ جو سچا نہیں اس کا دل ہر بُرائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "یا رسول اللہ! مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر چھوڑ دوں"۔ ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا۔ اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف

ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا لیکن پھر اسی خیال نے اُس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہیں کرتا ہوں تو بدعہدی ہوتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوتی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی "یارسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں"۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے۔[1]

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ سچائی کی عادت انسان کو بہت سی بُرائیوں سے بچاتی ہے۔ جو سچا ہوگا وہ ہر بُرائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایمان دار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اُس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کرے گا۔ غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصل بنیاد قرار پاتی ہے۔

صدق: صفاتِ ربانی میں سے سب سے بڑی صفت ہے۔ خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے۔ قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۝ اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔

(النسآء: ۸۷)

---

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۃ ن میں کتب سیر کے حوالے سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔

Marfat.com

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے:

وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا ○ (النساء: ۱۲۲)

وعدہ کیا اللہ نے سچ۔ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

خدا سچا ہے اسی لیے اس کی ساری شریعت سچی ہے۔ فرمایا:

وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ○ (الانعام: ۱۴۶)

اور ہم ہیں سچے۔

قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ (آل عمران: ۹۵)

کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔

وَالَّذِىۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ○ (الزمر: ۳۳)

اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔

اس آخری آیت میں "سچائی" سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔ اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں۔

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ (الاحزاب: ۲۲)

اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا۔

چونکہ رسول خدا سے علم پاتے ہیں اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں:

Marfat.com

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

(یٰسٓ : ۵۲)

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے۔ کیونکہ اُن کی ساری باتیں، دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے۔ سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ (مریم : ۴۱) اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وُہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے نامزد کیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ (مریم : ۵۶) اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وُہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا اس وصف سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ (المائدۃ : ۷۵) اور اُن (عیسٰی) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے کہ بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف : ۴۶) یُوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ	اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر،
كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا	بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا
نَّبِيًّا ○ (مریم: ۵۴)	ہوا نبی تھا۔

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی اُن میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ	صبر کرنے والے اور سچے۔
(آل عمران: ۱۷)	

خدا نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجرِ عظیم کے وعدے کئے ہیں اُن میں اسلام وایمان اور خدا کی فرماں برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَ	بے شک اسلام قبول کرنے والے
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ	مرد اور عورتیں اور ایمان لانے والے
وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور
.... اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ	عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○	.... خدا نے اُن کے لیے مغفرت
(الاحزاب: ۳۵)	اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔ قیامت کی نسبت ہے:

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو اُن کا سچ

Marfat.com

بِصِدْقِهِمْ (المائدة: ۱۱۹) کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ (الاحزاب: ۲۴) تاکہ اللہ سچ بولنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو اور ان ہی کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالکؓ اور اُن کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے خدا فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (التوبة: ۱۱۹) اے ایمان لانے والو خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو۔

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی ... دیتی ...

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی نگاہ میں اس

Marfat.com

کے بڑے وسیع معنی ہیں جن کے لحاظ سے اِس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتلائے ہیں: بات میں سچائی، ارادہ اور نیّت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔ لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں یعنی زبان کی سچائی، دِل کی سچائی، اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی

یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے۔ یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے۔ اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دِل کے نفاق کے ہم معنی ہے۔ سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ	دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے
اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ	یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے۔

(الاحزاب: ۲۴)

اس آیتِ پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے۔ صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص

Marfat.com

نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مُسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہو سکتا ہے۔ پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے؟ جواب دیا "ہو سکتا ہے"۔ پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا "نہیں[1]"۔ کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر" (نہیں[2]) مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر بُرائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا "کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وُہ حق ہی پر کیوں نہ ہو[3]"۔ ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓو صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس میں چار باتیں ہوں وُہ پکا منافق ہے اور جس میں اُن میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جب تک وہ اُس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امانت اُس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھُوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پُورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے[4]"۔ یہی روایت اِس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے[5]"۔ صحیح مسلم میں اِس کے بعد ہے "اگرچہ وُہ

---

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب۔ [2] عن ابی امامۃ مسند احمد وعن سعد بن ابی وقاص مسند بزار وابی یعلیٰ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمرؓ وقد روی مرفوعاً وموقوفاً۔ [3] مسند احمد عن ابی ہریرہؓ وطبرانی نیز مسند ابی یعلیٰ من عمر بن الخطابؓ۔ یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب و ترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں۔ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان، وصحیح مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی۔ [5] صحیح بخاری کتاب الایمان وکتاب الادب وصحیح مسلم۔

نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو[1]"

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے۔ یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے۔ اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے۔ اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے یہانتک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[2]۔"

دِل کی سچائی

صدق کی دوسری قسم دِل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اِس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وُہ دِل کی تہ سے نہیں نکلا۔ منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپؐ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی لیکن چونکہ یہ اقرار اُن کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنٰفقون: ۱)

اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں۔ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری کتاب الادب۔

آپ خدا کے رسول ہیں لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں۔ اُن کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے جس کی بُرائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے۔ اور ہر ایک اپنے علم، دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا۔ لیکن ان کارناموں کو سُن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔ یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کیے گئے تھے تاہم چونکہ اُن میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھوٹ کہا کہ اُن کے کارناموں کی حقیقی غرض خُدا کی خوشنودی نہ تھی بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔[1]

عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو۔ یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں۔ مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اُس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے۔ لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے۔ ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے اُس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ

Marfat.com

کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں۔ اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے۔ اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے۔ خدا نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا)
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	شک (و شبہ) نہیں کیا اور اللہ کے رستے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ	میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ یہی
الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات: ۱۵)	سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا۔ زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کر دی۔

اس صدقِ عمل کے کئی مرتبے ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو۔ مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو۔ منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدمِ یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ	اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے
سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ	ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی

Marfat.com

مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ قف فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ قف فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝

(محمد: ۲۰-۲۱)

سورت نازل ہو۔ پھر جب کوئی سورۃ اترتی ہے اور اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم اُن کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو۔ تو اُن پر تُف ہو۔ (رسول کی) فرمانبرداری چاہیے اور صاف وصحیح جواب دینا۔ چاہیے اور جب بات پختہ ہو جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ اُن کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عمل کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول وقرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرلے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو۔ اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے خدا نے اُن کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انس بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی تلافی

Marfat.com

کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جاں بازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسّی زخم کھا کر شہادت حاصل کی۔ ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی[1]:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(الاحزاب: ۲۳-۲۴)

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی ترد و بدل نہیں کیا تا کہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن کو معاف کرے[2]۔ بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب [2] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو، اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا اُن کو معاف فرما دے۔

Marfat.com

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دِل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جاتے۔ قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدّیق کہا ہے۔ اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دِل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اسی کیفیت کا ذکر آتا ہے۔ ایک بار ایک صحابی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں"۔ آپؐ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے "میرا دِل دُنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دِن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الہٰی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہلِ جنت باہم مل جُل رہے ہیں۔ گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں"۔ ارشاد ہوا کہ "تم نے جان لیا۔ اسی پر قائم رہو"[1]

صحابہؓ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبتوں میں اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے انہوں نے پوچھا "حنظلہ کیا بات ہے"؟ بولے "میں منافق ہو گیا۔ ہم لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپؐ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دُنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اب دونوں بزرگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور

---

[1] اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالکؓ۔

Marfat.com

یہ واقعہ بیان کیا۔ ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے۔ یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے[1]۔

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ (التکاثر ۵)	ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوا کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو اُن کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے۔ اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور

[1] ترمذی ابواب الزہد۔

صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۷۷)

تنگی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت میں ثابت قدم رہے۔ یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔ اول اُن کے ایمان کا کمال، دُوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں اُن کا ہر طرح پورا اترنا۔ اور جو لوگ علم اور عمل کے اِن تمام فضائل کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں اُن کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہیں[1] جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے۔ چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمراہی کا ذریعہ اللہ اور رسُول کی کامل اطاعت ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○ (النساء: ۶۹)

اور جو اللہ اور رسُول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دُوسرے) نیک بندے۔ اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمانِ کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ

اور جو اللہ اور اس کے رسُولوں پر

---

[1] الصدیق الذی یصدق قوله بالعمل (مجمع البحار فتنی)

صدیق وُہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

Marfat.com

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ   ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

(الحدید: ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا۔ یہ حدیث اُوپر گزر چکی ہے کہ "انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے۔" اِس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قایم رہنے کی ضرورت ہے۔

اِس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے۔ زبان کی سچائی، دِل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

Marfat.com

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔ سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں۔ اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے۔ اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اور ہم نے اُن کو جو روزی دی اُس

Marfat.com

میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ (البقرۃ : ۳)

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں[1]، بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دی گئی پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی۔ خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ زکوٰۃ کی اصل روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے۔ جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا۔ اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے۔ سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا — اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور۔

Marfat.com

رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۲۵۴) ؎

سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے۔ نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے۔ اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے۔ اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے جو خدا کی روزی کی نعمت پا کر اُس کے شکرانہ میں اِس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر اُبھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اُس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے، ضرور ہے کہ اُس میں خلوصِ نیت ہو۔ اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو۔ خود رسُول کو فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ؎ اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ (زیادہ بدلہ چاہے)۔ اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا۔ ارشاد ہے:

؎ المدثر: ۶۔

Marfat.com

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝

(البقرۃ: ۲۶۲)

جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کیے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اُولاہنا دیتے ہیں، اُن کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے۔ اور نہ اُن کو ڈر ہوگا، اور نہ وُہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡهِ ؕ

(البقرۃ: ۲۶۷)

اے وُہ لوگو جو ایمان لائے ہیں اس سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا، اچھی چیزیں خرچ کرو۔ اس میں سے بُری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو جو کہ تم دیتے ہو حالانکہ تم آپ اس کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو۔ جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا۔ صاف فرمایا:

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اُس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو

مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ○ پسند ہے۔ اور جو بھی تم خرچ
(آل عمران: ۹۲) خدا جانتا ہے۔

یعنی خدا دِل کے حال سے خبردار ہے۔ کِس نیت سے اور کِس طرح کا مال تم دے رہے ہو اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر ان سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اِسی لیے وُہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے۔ اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا۔ دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبُوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو۔ اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا۔ فرمایا:

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ○
(البقرۃ: ۲۷۲)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کرو، وُہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے

Marfat.com

قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً

اچھا قرض تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گُنا کرے۔

(البقرۃ: ۲۴۵)

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو وُہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے۔ اور ہے اس کے لیے عزت کی مزدوری۔

(الحدید: ۱۱)

آگے چل کر پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ (الحدید: ۱۸)

بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

(المزمل: ۲۰)

قرضِ حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وُہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلے میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، اُس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو۔ بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اُن قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے۔ ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ

ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے:

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا — اور اگر تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔

(المائدۃ:۱۲)

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا:

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ — تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

(المائدۃ:۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے تھے، خدا نے اُن کی تعریف فرمائی:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ — اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔

(التوبۃ:۹۹)

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی:

اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ — ہاں! وہ اُن کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے۔ اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(التوبۃ:۹۹)

متقی سخیوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ	اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین۔ تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔ جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔
(آل عمرٰن: ۱۳۳-۱۳۴)	

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیوں کر ہوگا دُور ہو جاتا ہے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے، اور اللہ کشائش والا ہے، سب جانتا ہے۔
(البقرة: ۲۶۱)	

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے

Marfat.com

سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے۔ خدا گنجایش اور کشایش والا ہے اُس کے ہاں ایک کا سو
جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور وُہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے۔
ی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خدا کی خوشنودی کے لیے اچھی نیت سے اپنا
ل دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۤءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○	اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا، اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

(البقرۃ: ۲۶۵)

اس مثال میں ٹیلہ کی اُونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے
وڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے۔ تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی
ے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ
ا جو دیا جائے وُہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے۔ اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے
لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ لیل
ا بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

۱۔ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ○ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ○

(الیل: ۵-۷)

تو جس نے (راہِ خدا میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سہج بات کا راستہ آسان کریں گے۔

۲۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ○ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ○ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ○ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ○ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ○

(الیل: ۱۷-۲۱)

۲۔ اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے۔ اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے، اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت یا نیک کا کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے۔ یہ نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے۔ دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے جود و سخا کا سبب دنیاوی امور کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو بلکہ مقصود صرف خدا ہو ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا دامن دل پاک ہو جائے۔ خدا فرماتا ہے تو خدا کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل

Marfat.com

پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو
میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے۔ دنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس
واقعہ پر گواہ ہے اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب
سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی بر ملا تعریف اور
جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس
کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیرووں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے
جاتی رہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۙ
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ
(الهمزة: ۱-۳)

پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب
کرنے والے پر۔ جس نے دولت اکٹھی
کی اور اس کو گن گن کر رکھا۔ سمجھتا
ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا
رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے،

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۙ
(الفجر: ۲۰)

اور تم مال و دولت سے بہت ہی
محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر
میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو
جائے گا۔ اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان

Marfat.com

لفظوں میں ادا کیا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

(البقرۃ: ۲۶۸)

شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے۔ اور خدا تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشایش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ کشایش والا ہے، جانتا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے۔ یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے۔ حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ

(البقرۃ: ۲۶۹)

وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے اس سراسر دھوکا ہے۔ اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلا درست ہے "بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمایش

زمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے۔ پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد
و پہنچا کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے۔ جس کے
ؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ○	تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے۔ اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے۔ تو اللہ سے ڈرو جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہ خدا میں) خرچ کرو اپنے لیے بھلائی کرو۔ اور جو اپنی جان لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔ اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

(التغابن: ۱۵-۱۷)

ان آیتوں میں انفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے وہ انسانیت
اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے۔ قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے
وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں یعنی جماعت کے کام ول
کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتی رہیں۔ اس کا

Marfat.com

فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تموّل کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بُخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے جھجکا نہ کریں گے۔ طور سخاوت کی تعلیم سے اِسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اُس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں

۱۔ میری چیز ہے میں دُوسروں کو کیوں دوں!

۲۔ دُوسروں کو دوں گا تو میرے کمی ہو جائے گی جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروؤں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف خدا کا ہے وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

(الحدید: ۱۰)

بُخل کی بُرائی میں کہا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ اُن کے حق

Marfat.com

لَهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اٰل عمرٰن : ۱۸۰)	میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ اُن کے حق میں بُرا ہے۔ قیامت کے دن اُن کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بُخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسولؐ کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہوگا، تردید کی۔ فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۗ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ	وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں[1]

---

[1] (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

Marfat.com

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (المنافقون: ۷)

اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اِسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغِ نبوی کی کُل چل رہی ہے اُن کے بل بوتے سے ہے۔ خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے۔ آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وُہ اُسی کا ہے۔ وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے۔ دُوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا۔ فرمایا:

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (الشوریٰ: ۱۲)

اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں۔ پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ کر دیتا ہے۔ وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں اِنسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں۔ اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدمِ محبت، ایثار، اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے تو دُوسرے میں انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی اور جذبۂ صبر کی آزمائش ہے۔ فرمایا:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ

سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی۔ اور جب

رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝ كَلَّا (الفجر: ۱۵-۱۶)

اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا۔ یہ کوئی بات نہیں"

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں۔ دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھ کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں۔ قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۚ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا

سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے تو ہم کو پکارے پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم[1] پر ملا ہے (خدا فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے۔ یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی[2]

---

[1] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا۔ دوسرا یہ ہے کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا۔ اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے۔ (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱ مصر۔)

[2] چنانچہ قارون کو جب راہ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (القصص: ۷۸) قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے"

Marfat.com

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(الزمر، ۴۹-۵۲)

تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی۔ اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنہگار ہیں ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں۔ وہ تھکا نہیں سکتے۔ کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔ اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اُس کے لیے آسان ہو جاتے۔ اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے۔ خدا نے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

(ھود: ۶)

اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر)۔ سب (علم الٰہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اُسی کا حصّہ تھا اس لیے درحقیقت وُہ ہمارا تھا ہی نہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے اُن یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے۔ وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے۔ خدا تعالیٰ پوچھتا ہے :

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (النمل : ۶۴)	اور تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے۔ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے ؟

روزی دینا اُسی کا کام ہے :

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○ (الذّٰریٰت : ۵۸)	بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور، مضبوط۔

احادیث میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے طرح طرح کے پُر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے۔ فرمایا " تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا[1]۔" یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دُوسروں کو نہ دو گے تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کرلے گا اور تم کو نہیں دے گا۔ ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا " تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے ؟" لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے۔ فرمایا " تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اُس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے[2]۔" ایک دفعہ

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ باب الحث علی الانفاق [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ما قدم من ماله فهو له۔

آپؐ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا "آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا یا کھالیا تو اُس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔"[1]

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اُحد کے پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اُس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں۔ میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔" پھر فرمایا "ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔" فرمایا "رشک دو ہی پر روا ہے۔ ایک اُس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اُس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔"[2]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اُس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اُس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی بُرائی قرآن پاک میں آئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے۔ اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے۔ اور جب

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔ حدیث حسنٌ صحیح۔ [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔[3] صحیح بخاری کتاب العلم۔

موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں۔ قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (المنافقون:۱۰)	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا۔

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المنافقون:۱۱)	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آجائے۔ اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔"[1]

فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے۔"[2]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۳ ص ۹۳ باب بیان افضل الصدقہ [2] صحیح مسلم باب الید العلیا۔

عفّت و پاکبازی

عفّت و پاک بازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جن کا لگاؤ عزّت اور آبرو سے ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (المؤمنون: ۵-۷)	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ باندیوں سے تو ان پر کچھ الزام نہیں۔ لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفّت و پاک بازی بھی ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ○ (المعارج: ۲۹) — اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاک دامن ہیں۔

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (الاحزاب: ۳۵) — اور اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہو گا کہ عفت اور پاک دامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظِ فروج" ہے۔ حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے۔ کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے۔ فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو۔ اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضا میں سے اُس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو۔ اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہو گا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ اِحصان ہے جو حِصن سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں۔ اس سے حصانٌ، اِحصانٌ، مُحصِنٌ اور مُحصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہیں۔ پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے۔ اس کے معنی پاک دامن عورت کے ہیں۔ دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں۔ یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے۔ دو دفعہ

Marfat.com

حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغہ میں:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم: ۱۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا۔

- وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء: ۹۱)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے۔ فرمایا:

فَاِذَآ اُحْصِنَّ (النساء: ۲۵) تو جب وہ نکاح کی قید میں آچکیں۔

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلے میں قرآن میں آیا ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (النساء: ۲۴)

حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (النساء: ۲۵)

حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں اسی لئے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بی بیاں) دو معنوں میں آیا ہے۔ ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

Marfat.com

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النسآء:۲۴) — اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔

دوسرے شریف آزاد بی بیوں کے معنی میں جیسے:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (النسآء:۲۵) — اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآنِ پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (النسآء:۳۴) — پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جزء ہے۔ نبی، نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہلِ بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم:۱۲) — اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء:۹۱) — اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا اس کی گواہی خود عزیزِ مصر

Marfat.com

کی بیوی نے دی:

وَلَقَدۡ رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ فَاسۡتَعۡصَمَ (یوسف: ۳۲)

اور میں نے اُس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لئے کیا:

لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝ (یوسف: ۲۴)

تاکہ ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی کو دور کریں۔ اور وہ بے شبہ ہمارے چُنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰؑ کی تعریف میں فرمایا گیا:

وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝ (آل عمران: ۳۹)

اور سردار ہوگا اور اپنی قوتِ شہوانی پر منبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہلِ بیتِ نبویؐ کی زندگی جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا يَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ۝ (النور: ۲۶)

یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لئے بخشایش ہے اور عزت دار روزی۔

عفت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ آیا ہے جس کے معنی

لہ اس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے

Marfat.com

بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے

اِلَّآ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (النساء:١٩) — مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ (النساء:١٥) — اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے۔ قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ۝ (بنی اسرآءیل:٣٢) — اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا"۔ اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی۔ اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا یا دوسری غیر شریفانہ حرکات کرنا ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لئے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا۔ مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے۔ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ — اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے

Marfat.com

اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ	کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور
ذٰلِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ	اپنے ستر کی حفاظت کریں۔ یہ اُن
بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ○	کے لئے بڑی ستھری بات ہے۔ اللہ
(النور: ۳۰)	جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے اس لئے اُن پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لئے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جُل کر نہ بیٹھیں، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤى (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں۔ فرمایا:

وَقُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ يَغۡضُضۡنَ	اور اے پیغمبر! ایمان والی بی بیوں
مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ وَيَحۡفَظۡنَ	سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی
فُرُوۡجَهُنَّ وَلَا يُبۡدِيۡنَ	رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت
زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا	کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں
وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى	مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنی
جُيُوۡبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ	اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام)

لہ جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی یا انگلیوں کی انگوٹھی۔ اسی لئے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ
بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا
مَلَکَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ
غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا
عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا یَضْرِبْنَ
بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ
مِنْ زِیْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَی
اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (النور: ۳۱)

پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر
اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے
شوہر کے باپ یا اپنے بیٹوں یا اپنے
شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے
بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں[1]
یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے
جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں
کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں
اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار
کو وہ چھپاتی ہیں اس کا پتہ لگ جائے۔
اور تم سب مل کر اے مسلمانو خدا کے
آگے توبہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسبِ ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے مگر عام عورتوں کے لئے اس میں پیروی کا نمونہ ہے؛

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ
مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ
الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر
کوئی عورت۔ اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو
سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو
کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ

---

[1] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی)۔

Marfat.com

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (الاحزاب: ۳۲-۳۳)

خواہش کرے[1] اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کے پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو[2]۔

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ (الاحزاب: ۵۳)

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدون کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہ ہو۔

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں۔ چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النور: ۲۷)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھر والوں کو سلام نہ دے لو۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیئے کہ پردہ کے اوٹ سے

---

[1] یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔ [2] التبرج اظهار الزينة للناس الاجانب (لسان العرب)

مانگے یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے۔ چنانچہ کاشانۂ نبویؐ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا	اور جب تم مانگنے جاؤ اُن بیویوں سے
فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ	کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے
ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ	اوٹ سے۔ اس میں تمہارے اور
(الاحزاب: ۵۳)	اُن کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لئے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں تاکہ اُن کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں۔ اُن کو چھیڑنا تو کجا اُن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ	اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں
وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ	اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے
يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ	کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں
ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا	نیچی لٹکا لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہ
يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا	پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں)
رَّحِيمًا ۞ لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ	تو ان کو ستایا نہ جائے۔ اللہ بخشنے والا
الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم	مہربان ہے۔ اگر اس پر بھی منافق اور
مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ	جن کے دلوں میں (بے حیائی کا)

Marfat.com

لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝

(الاحزاب: ۵۹-۶۰)

روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکے تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے۔ اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھے تھے۔ اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالٰے نے دونوں کو دو حکم دیئے۔ شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے۔ اور مسلمان بی بیوں کے لئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں۔ اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1] اور لوگ ان کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی ابن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے۔ عورتیں بناؤ سنگار

---

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورۂ نور ص۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر۔

کرکے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کرسکے[1] اور نشان کے لئے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں۔ اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی۔ بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا جائے۔ چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى	اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی
الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا	ہوکر رہنا چاہیں تو اُن سے دنیا کی زندگی
لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ	کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی بدکاری
وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ	نہ کرایا کرو، اور جو اُن کو اس پر مجبور کرے
مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ	گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے
رَّحِيْمٌ ۝ (نور ۔۔۔)	والا رحم فرمانے والا ہے۔

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے[2]۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہوجاتی۔ سنن ابی داؤد کتاب النکاح میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی۔ وحیِ الٰہی نے اُن کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً	بدکار مرد بدکار ہی عورت یا مشرکہ

---

[1] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر ہے۔ رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ ۔ بجس الندامی بضۃ المتجرد۔

[2] صحیح مسلم باب تحریم حلل البغی وغیرہ۔

Marfat.com

اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (النور: ۳)

عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا اور ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے۔ اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ (النور: ۲۶)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے۔

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاک باز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں[1] اور ان کی دلیل سورۂ نور کی

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے۔ اور اس آیت سے اس کی جو حرمت سمجھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے یا یہ کہ اہلِ ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اور فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے۔ لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے۔ بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا۔ باقی اگلے صفحہ

Marfat.com

اوپر والی آیت کے علاوہ وہ حدیث ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے[1]۔

غرض اہلِ ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیئے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ (الفرقان: ۶۸)

اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے۔ اس کے بعد جو دو باتیں ہیں اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شو میں کفو ہونا شرط ہے۔ اور چوں کہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے۔ اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو۔ توبہ کرنے کے بعد جائز ہے۔ (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملاجیون و تفسیر کبیر رازی و روح المعانی در تفسیر آیت مذکورہ)۔

[1] ابوداؤد کتاب النکاح۔

Marfat.com

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں ان کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپؐ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں[1]۔ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ "اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دکھنا جائز نہیں[2]" حکم دیا کہ "مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں[3]"۔ فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہلِ خانہ کی بے ستری ہو[4]۔ فرمایا کہ "عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے[5]" سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ "عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے[6]" تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے۔ یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے[7] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے۔ یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے۔ اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس

لے ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرة الفجاءة ۲ے ابو داؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأة زینتها ۳ے ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین ۴ے ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت ۵ے ابو داؤد کتاب الترجل باب فی المرأة تطیب للخروج ۶ے ابو داؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق ۷ے مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوة بالاجنبیة والدخول علیها۔

Marfat.com

گیا تو اُس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے[1]۔

یہ ساری ہدایتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کے لئے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا	بدکاری کرنے والی عورت اور
كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ	بدکاری کرنے والے مرد ان میں
(النور: ۲)	سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں[2] میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے۔ اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لئے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے اُن میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی۔ فرمایا:

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ	اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی
أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ	اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے
بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ	ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان
وَأَرْجُلِهِنَّ (الممتحنۃ: ۱۲)	باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت [2] یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔

Marfat.com

سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو[۱] یا یہ بات بھی عدمِ قتل کے عموم میں داخل ہو۔ اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے۔ جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی۔ جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ اُن میں سے کس کا لڑکا ہے۔ بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بتا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں۔ یہ ساری باتیں عفّت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں۔ اس لئے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ فتح مکّہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں[۲] سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا[۳]۔ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر بیعت[۴] کی۔

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے۔ اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون جھوٹے بدنام کرنے کے جرم میں اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔ اور اس کی گواہی کبھی معتبر نہ ہوگی۔ اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے۔ اور اگر دونوں اپنے دعوؤں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[۵]۔

---

[۱] مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔ [۲] صحیح بخاری فتح مکہ۔ [۳] تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ

[۴] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔ [۵] اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے۔ اس کے بعد نکاح توڑ دینے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے۔ بخاری باب اللعان۔

Marfat.com

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ اور حقوقِ عباد میں
میر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے۔ اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی
ا عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "اے
اکے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟" فرمایا "یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے
کو پیدا کیا" بولے "اس کے بعد؟" فرمایا "یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے
اتھ کھائے گا" بولے "اس کے بعد؟" فرمایا "یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو"۔ چنانچہ
راوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی[1]۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا)
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ	کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس
وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ	کو خدا نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا
(الفرقان: ۶۸)	کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت
سلئے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک
ں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد و اعتبار کو
دمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ۔

چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا[1] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے۔ اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا۔ اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگ سار کرنا ہے۔ لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے۔ ایک روحانی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگوں کے اُخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں۔ ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعلِ قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں۔ جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے[2] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہا

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شرب الخمر۔ [2] بخاری کتاب الجنائز۔

Marfat.com

انکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں[1]۔

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا۔ لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتہً پانی برسنے لگا۔ تینوں نے پانی سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔ سو، اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں۔ چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دُعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا۔ ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی۔

خُداوندا! میرے ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا۔ میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی۔ میں نے سو دینار کما کر جمع کئے اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی لیکن اس نے کہا کہ خُدا سے ڈرو۔ میں فوراً رک گیا۔ خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے۔ چنانچہ وہ سرک گیا[2]۔

یہ روایت عفت و پاک بازی کو اُن اعمال میں شمار کرتی ہے جن سے خُدا کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش [2] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعا من بر والدیہ۔

Marfat.com

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے۔ اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ○

(الاحزاب: ۷۲)

ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو خائن ٹھہریں گے۔

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا امانت سے متصف ہوتا تھا تاکہ بندوں کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے۔ اسی لئے قرآن میں اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ (الشعراء: ۱۹۳) — اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔

مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝ (التکویر: ۲۱) — اس کا کہا مانا جاتا ہے وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ (الشعراء: ۱۷۸) — میں تمہارے لئے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں۔ اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا کیونکہ آپ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں اُن کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی:

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ (المؤمنون: ۸)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی فتح مکہ کے وقت وہ اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اُتری:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی۔ انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا اُن پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ بات یہ: تقدم شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کی ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی[1] ہے اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[2]۔ اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائیداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت

[1] تفسیر کشاف زمخشری [2] تفسیر ابن جریر طبری۔

ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے۔ کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سُن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ کسی نے آپ سے اپنے کسی نجی کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سُن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کی شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

اُن مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَٰنَٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ○

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

(المؤمنون: ۸)

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے اُن میں بھی وہ داخل ہیں:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَٰنَٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ○

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

(المعارج: ۳۲)

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ ؕ (البقرة: ۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیئے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیئے کہ اپنے پرورد گار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے:

وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (الانفال: ۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی۔ اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجیئے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ ۖ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ۝ (القصص: ۲۶)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجیئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے۔ اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس

اس کو امانت داری کے ساتھ انجام دے سا ب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو وہ ایک دو گھنٹہ لغستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا۔ یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کی بہت سی جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں سُنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی اُن کی فطرت ہوتی ہے)، پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے)۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی سُنایا۔ فرمایا" پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا۔ اس وقت امانت داری کی مثال ایسی کم یاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے۔ آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے حالانکہ اس کے

Marfat.com

دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہو گی۔"

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بُری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں۔ اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہو گا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہو گی جب تک اس کا دل درست نہ ہو گا اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی۔ اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہو گی۔ اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہو گا۔ بُری چیز بُری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔"[2]

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں"[3]۔ اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپؐ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے

---

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ وکتاب الفتن والرقاق وصحیح مسلم و مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ۔ [2] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ حیدر آباد۔ از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ۔ [3] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل، و بیہقی فی شعب الایمان۔

Marfat.com

اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے[1]۔ اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ "مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں"۔ یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیئے۔ الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہوں مگر تین موقعوں پر کہیں کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبروریزی کی یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے[2]۔ راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً اِدھر اُدھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے[3]۔ امانت میں خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے[4]۔

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "عورتوں کے باب میں خدا سے ڈرو"۔ فرمایا "کیوں کہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت[5] میں

---

[1] ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن [2] ابو داؤد باب فی نقل الحدیث [3] ابو داؤد کتاب الادب۔

[4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [5] صحیح مسلم، حجۃ الوداع۔

لیا ہے۔"

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ "سب سے پہلے اِس اُمّت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہو گی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ خدا کے ہاں نہیں[1]۔" فرمایا میری اُمّت "اُس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی[2]۔" یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے اُن کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس [2] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از سنن سعید بن منصور رحمہ

Marfat.com

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے۔ عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے۔ درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروّت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خُداوند تعالیٰ ہے۔ لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو بُرائی کرتے دیکھتا ہے لیکن اُن کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عزت اور جلال والے خُدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے"[1] ایک دفعہ تین صاحب مجلسِ نبویؐ میں آئے آپؐ کے ارد گرد صحابہ کا حلقہ تھا۔ ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے۔ دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے۔ تیسرے صاحب چلے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء والصفات الٰہ آباد ص ۳۴۰۔

ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی۔ اور جو پیچھے جا کر بیٹھا وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے خدا سے منہ پھیرا تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔[1]

سورۂ بقرہ میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا (البقرۃ: ۲۶)	خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں۔ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ[2] (خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ حدیث میں بھی ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ[3] (اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں)، قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت و حیا کے خلاف ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے"[4]۔

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا۔ ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں۔ اور جب ان کے باپ

---

[1] بخاری کتاب العلم و صحیح مسلم باب السلام [2] الاحزاب: ۵۳ [3] بخاری کتاب الادب باب مالایستحی من الحق [4] صحیح مسلم کتاب التوبہ، عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب ہو جاتے ہیں۔ غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

Marfat.com

نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لئے بھیجا:

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (القصص: ۲۵) — تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح و ستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا۔ ستر عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا۔ بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا۔ برہنگی کو منع کرنا یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا اسی لئے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں۔ اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے۔ آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا میرا تہبند۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا۔[۱] نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حياء من العذراء — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے

۱۔ بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ و بنیانہا۔

فی خدرہا تھے۔

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے:

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ (الاحزاب: ۵۳)	تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے۔ جب اس میں بُزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے حیا کی حقیقت میں بُزدلی کا جو جز شامل ہے شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں شرم و حیا دامنگیر نہ ہو۔ لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا۔ اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا۔ اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیوں کہ حیا ایمان سے ہے۔[۱]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے اجتناب کیا جائے اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے۔ اس لئے وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے ان کو اس

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب الحیا۔

Marfat.com

شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے۔ اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہارِ حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے۔ مثلاً خدا نے قرآنِ مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے۔ خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہیں شرماتا یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ (البقرۃ: ۲۶)	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں ، ذرا بھی، نہیں جھینپتا، چاہے وہ مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ تاہم چوں کہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِىَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ (الاحزاب: ۵۳)	اس سے پیغمبرؐ کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں کسی کا کچھ لحاظ کرتا نہیں۔

Marfat.com

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خوش خلقی اور مروّت کے خلاف تھا اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی۔ تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا۔ ایک صحابیہ آپؐ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے۔ تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ "یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا۔ کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟"

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی"۔ اکابر صحابہ اس درخت کے نام بتانے سے قاصر رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ تاہم چوں کہ کمسن تھے اس لئے شرم سے چپ رہے لیکن چوں کہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔[1]

انصاریہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نعم النساء نساء الانصار	انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ
لم یکن یمنعھن الحیاء ان	دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین۔

یتفقھن فی الدین[1] حیا نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت. تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحیاء لایاتی الا بخیر[2] حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی بُرے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ کیونکہ یہی جذبۂ حیا ہے جو انسان کو بُرائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرك الناس من کلام النبوۃ الاولیٰ اذا لم تستحي فاصنع ما شئت[3]

لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں۔ اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے

---

[1] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسك فی موضع الدم۔ [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔ [3] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت۔ فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۴۲۲۔

Marfat.com

کہ ہر دین کا ایک خاص خُلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خُلق حیاء ہے[1]۔ یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[2]۔ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو اُن سے شرماؤ اور اُن کا خیال رکھو[3]۔

مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ما جاء فی الاستتار عند الجماع۔

جنت کا میوہ

احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں
کامیاب زندگی گزارنے کے رہنما اصول

ترجمہ

الاستاذ محمد رمضان

زاویہ پبلشرز
۶۔ مرکز الاویس (رستا ہوٹل) دربار مارکیٹ۔ لاہور
فون: ۷۲۳۸۶۵۷ — موبائل: ۰۳۰۰-۹۴۶۷۰۴۷

Marfat.com